زیر نظر کتاب میں اٹھانوے اشکالات مع جواب درج ہیں، پہلے امام طحاوی کی اصل عبارت مع حوالہ نقل کی گئی ہے، پھر اسکے متعلق اشکال اور آخر میں جواب، ناموں کی تصریح کے ساتھ درج ہے۔ مگر جواب میں یکسانیت نہیں ہے، کچھ اردو اور کچھ عربی میں ہیں، اگر عربی جواب کا اردو ترجمہ کر دیا جاتا تو فائدہ دوچند ہو جاتا، اردو جواب کی زبان اور پیرایۂ بیان قدیم طرز کا ہے، تاہم اس کتاب سے حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔

روح البیان (حصہ دوم) از مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۰۰ قیمت بارہ روپے ناشر ڈاکٹر ابرار احمد نمبر ۵ سلطان پور، بھادر، الہ آباد

مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھی حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے خلیفہ حضرت شاہ بدر علی کے خلیفہ اور خود ایک بڑے شیخ طریقت ہیں، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی وفات کے بعد ان کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی ہے، مشرقی یو۔پی کے لوگوں کو خاص طور سے ان سے بڑا فیض پہنچ رہا ہے، مولانا کے عقیدت مندوں نے افادۂ عام کے خیال سے ان کے مواعظ کا ایک مجموعہ پہلے شائع کیا تھا اور اب یہ دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں رضائے الٰہی کے حصول، آخرت کے استحضار، کتاب و سنت کے اتباع، ذکر، تلاوت و عبادت میں مشغولیت، اخلاق و معاملات کے تصفیہ قلب کے تزکیہ، نیت کے اخلاص، عمل کی اصلاح، صلحا کی صحبت اور اہل اللہ کی ہم نشینی وغیرہ کی تلقین پُر اثر انداز میں کی گئی ہے، مواعظ کو پڑھ کر قلب میں گداز روح میں بالیدگی، دل میں عمل کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور آخرت کی فکر میں اضافہ ہوتا ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر مقدمہ اور ایک وعظ کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی موثر تعارفی تقریر بھی ہے، زبان آسان اور عام فہم ہے تاکہ ہر ذوق و استعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ "ض"

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

۱۹۷۰ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی پاکستان تشریف لے گئے تھے، تو وہاں کے قیام کے زمانہ میں ایک علمی مجلس میں سوال کیا گیا کہ پاکستان میں معارف کی طرح کوئی رسالہ نکلتا ہے کہ نہیں، تو ایک صاحب بول اٹھے کہ جی نہیں، یہ خاکسار بھی اس مجلس میں تھا، جب اس کی اشاعت کی تعداد مجھ سے پوچھی گئی تو اس کے بتانے میں کچھ محجوب سا تھا،

معارف ۱۹۱۶ء سے برابر نکل رہا ہے، اس ۶۳ برس میں کسی مہینہ ناغہ نہیں ہوا، اتنی طویل مدت میں ایسی پابندی شاید ہی کسی اور رسالہ کی اشاعت میں کی گئی ہو، الحمد للہ جس مقصد سے یہ نکالا گیا، اس کی بھی تکمیل برابر ہوتی رہی، اور مدح و تحسین کے پھول بھی اس پر نچھاور کئے جاتے رہے، ڈاکٹر اقبال نے اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم جوہر کو بھی اس رسالہ سے بڑا انس رہا، اپنے ایک مکتوب میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ میں رسالوں کی جلدیں نہیں بندھواتا ہوں، مگر یہ شرف خاص رسالہ معارف کو حاصل ہے کہ میرے پاس یہ مجلد ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک خط میں استاذی المحترم ہی کو تحریر فرمایا تھا کہ معارف ہی ایک پرچہ ہے، ورنہ ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ مولانا شبلی کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں، پاکستان کے مشہور صاحب قلم عبدالمجید صاحب سالک مرحوم نے جنوری ۱۹۵۴ء کے رسالہ ماہ نو کراچی میں لکھا کہ ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین کا مشہور و معروف علمی رسالہ معارف جاری ہوا، جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے، اور جس نے ہمارے تحقیقی و تاریخی ذخیرے کو مالا مال کر دیا۔

معارف کے پرانے پرچوں کی مانگ آج کل بڑھی ہوئی ہے، کراچی کے ممتاز اور مشہور ادیب جناب شفیق خواجہ نے ۱۹۱۶ء تک کے معارف ابھی منگوائے، تو لکھا کہ اگر یہ رسالے اُن کے کتب خانے میں نہ ہوتے تو وہ بہت بڑی دولت سے محروم رہتے، کراچی ہی کے علم کے شہزادے جناب سید حسام الدین راشدی کو یہ رسالہ کسی مہینہ نہیں ملتا ہے تو تقاضا آتا ہے کہ ان کو یہ ہر مہینہ رجسٹری سے بھیجا جائے تاکہ اُن کو ضرور ملے، معارف کی اس قدر دانی کے باوجود اگر سوال کیا جائے کہ اس ۶۳ برس میں اس کے لئے کتنا سرمایہ جمع ہو چکا ہے تو اس کے جواب دینے میں شرمندگی محسوس ہوگی،

شروع سے اس کے اڈیٹر کی کوئی تنخواہ نہیں رہی، اس کے مضمون نگاروں کو کوئی اجرت بھی نہیں دی جاتی، صرف اس کی لکھائی چھپائی، جزبندی اور کاغذ کی خریداری میں خرچ ہوتا ہے، اگر کسی اڈیٹر سے گذشتہ ۶۳ برس کا حساب آڈٹ کرایا جائے، تو اس کی رپورٹ یہی ہوگی کہ جب اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں تو اس کو کیوں جاری رکھا گیا ہے، اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں، کل پندرہ روپیہ سالانہ ہے، ابھی حکومت دہلی کے ایک بہت بڑے ہندو افسر دارالمصنفین تشریف لائے، اپنی علم دوستی سے یہاں کی ہر چیز دیکھی، معارف کی سالانہ قیمت سن کر بولے کہ اس سے تو اس کے ٹائٹل کے خریدنے میں بھی یہ رقم کم پڑتی ہوگی، اس کی سالانہ قیمت یقیناً بہت کم ہے، پھر بھی زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو معارف کے خریدار بننے کے بجائے ایک روز میں کافی کی پیالیاں پینے میں کئی پندرہ روپیے خرچ کرنا زیادہ پسند کریں گے،

ممکن ہے کہ یہ الزام رکھا جائے کہ معارف کا اشتہار نہیں ہوتا، اور دوسرے رسالوں کی طرح اس کے لئے گھر گھر جا کر خریدار نہیں بنائے جاتے، دارالمصنفین نشر و اشاعت کا کوئی تجارتی ادارہ نہیں، یہ ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوا تھا، اور اس نے ملک میں جو وزن اور وقار پیدا کیا ہے، اس کو برقرار رکھنے میں یہ دریوزہ گری کسی طرح مناسب نہیں، دارالمصنفین نے

گذشتہ ۶۳ برس میں کسی سے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، یہاں کے خدمت گذاروں کا یہ شیوہ رہا ہے، کہ وہ اپنی علمی زندگی میں مالی صعوبتوں کی پریشانیاں برداشت کرلیں، مگر اس کے وزن اور وقار میں حتی الامکان کمی نہ آنے دیں،

.....⁂.....

اگر دارالمصنفین کے ساتھ معارف بھی اپنا فرض لوگوں کی توقعات کے مطابق ادا کر رہا ہے تو کیا وہ خود ان لوگوں سے یہ توقعات نہیں کرسکتا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کریں، اگر معارف سے واقعی حرارت ایمانی پیدا ہوتی ہے اس سے علمی تشنگی دور ہوتی ہے، اور یہ گھروں میں علمی دولت پہنچاتا ہے تو یہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ خریدار ہوں،

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ۱۹۶۵ء ہی میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کی رسم افتتاح کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ "دارالمصنفین کے قدردانوں، معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے کہ قدردانی تعریف اور شکر گذاری اپنی جگہ بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن ان سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے نہ بھاپ بنتی ہے نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالم مادی میں ذہنی اور روحانی کاموں کے لئے بھی مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دارالمصنفین کے قیام کو علم و ادب و ملک و قوم کیلئے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے، اور یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے، کہ قدمے سخنے سے آگے بڑھ کر دامے درمے سے اس کی دل کھول کر مدد کریں"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس میں دارالمصنفین کے خدمت گذار یہ ترمیم کرتے ہیں کہ ہم کو دامے درمے کی امداد نہیں چاہئے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد جو کہا تھا وہ ہم چاہتے ہیں، انھوں نے بڑی دلسوزی سے فرمایا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ ارباب علم و دانش زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی مطبوعات کے (جس میں معارف بھی شامل ہے) خریدار بنیں گے، اور ارباب حکومت و اقتدار کو اس پر آمادہ کریں گے کہ انھیں مدرسوں اور عام کتب خانوں کیلئے خریدیں، یہ کوئی احسان نہ ہوگا، بلکہ ایک چھا سودا ہوگا جس میں چاندی کے چند ٹکڑوں، بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آئے گی، جو بے بہا اور لازوال ہے"!!

مقالات

امیر خسرو اور افضل الفوائد

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جعلی ملفوظات میں ایسا مواد بالکل نہیں ہے، جو اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالتا ہو، یہی کیفیت افضل الفوائد کی بھی ہے، (ص ۸۲)

اگر اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ کے حالات مراد ہیں، تو فوائد الفواد میں سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد بن تغلق کے دور کے سیاسی و معاشی حالات ملنے چاہئیں، مگر ان سلاطین کا اس میں مطلق ذکر نہیں، البتہ محمود غزنوی، شمس الدین التتمش، رضیہ اور ناصر الدین محمود کا ذکر ضرور ہے، مگر افضل الفوائد میں بھی محمود غزنوی، معز الدین سام اور شمس الدین التتمش کا ذکر ہے، اس سے نسبتاً زیادہ تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

فوائد الفواد میں محمود غزنوی کا ذکر احترام سے کیا گیا ہے، یہی احترام افضل الفوائد میں ہے، جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی مجلس کی حسب ذیل روایت سے ظاہر ہے۔

"حضرت خواجہ نے فرمایا کہ سلطان محمود غزنوی کے دو زنار دار (یعنی ہندو) اس کے یہاں سے روتے ہوئے واپس گئے، اور اپنے بت خانہ میں پہونچے، انھوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ الٰہی! اگر ہم لوگ اسلام (مسلمانی) سے دور ہیں، تو ہم لوگوں کو تو ہی نے پیدا کیا ہے، تمام بندے تیرے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں، اگر تو ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے گا تو ہم اس جگہ سے باہر نہ جائیں گے، اور نہ ایک دوسرے سے بات کریں گے، پھر وہ دونوں مندر (بت خانہ) میں بیٹھ گئے، اسی روز سلطان محمود انار اللہ برہانہ کے پیٹ میں درد اٹھا، کبھی تخت پر سے زمین پر گر جاتا، اور کبھی زمین پر سے تخت پر آجاتا، اولیاء اور حکماء اس کے گرد جمع ہو گئے، علاج ہوا، دعائیں ہوئیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ اور حالت خراب ہوتی گئی، اور جب سب عاجز ہو گئے تو سلطان محمود نے حسن میمندی کو بلایا اس سے کہا کہ لوگوں کی کوئی تدبیر کام نہیں کر رہی ہے، اب خدا ہی کچھ کر سکتا ہے، خواجہ بہلول دیوانہ کے پاس جاؤ، اور ان سے درخواست کرو، شاید صحت پا جاؤں، جب حسن میمندی خواجہ بہلول کے پاس پہونچا تو خواجہ نے تبسم کیا، اور فرمایا محمود کو کوئی ضرورت آپڑی ہے، اسی لئے تجھ کو بھیجا ہے، بتاؤ کیا بات ہے، سلطان محمود کے پیٹ کے درد کا حال ان سے کہا گیا، تو وہ ہنسے اور بولے کہ جاؤ کہہ دو کہ وہ اپنے قصر کے در پر طبل بجانے کا حکم دیں، اسوقت بھلا ہو جائے گا، حسن میمندی نے یہ بات سنی تو واپس ہوا، سلطان سے یہ سب کچھ کہا، پھر ایسا ہی کیا گیا، جب قصر کے اوپر طبل بجا تو وہ دونوں ہندو ایک دوسرے سے بولے کہ

شاید سلطان محمود کی وفات ہو گئی ہے، یا کسی نے ہم لوگوں کا حال اس سے بتلایا ہے، اسی لیے یہ طبل بجا ہے، جس وقت ان دونوں نے یہ بات کہی تو سلطان کے پیٹ کا درد جاتا رہا، سلطان گھوڑے پر سوار ہو کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بہت معذرت کی، خواجہ نے کہنا شروع کیا کہ دوسرے لوگ رہزنی کرتے ہیں، اور تمہارے پیٹ میں درد ہوتا ہے، ملازمین ظلم کرتے ہیں، اور بلا ان کے مالک پر نازل ہوتی ہے، خواجہ نے ان ہندوؤں کی کیفیت سے سلطان کو مطلع کیا، وہ وہاں سے واپس ہوا تو ان ہندوؤں کے پاس پہونچا، ان کو خوش کیا، اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کو واپس کیا، یہ حکایت سنا کر حضرت خواجہ (یعنی حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا) کی آنکھیں پرآب ہو گئیں، اور روئے اور فرمایا، بیگانوں کو ستانے میں تو یہ حال ہوتا ہے، اپنے یگانوں کو ستانے میں قیامت کے روز کیا حال ہو (قلمی نسخہ ص ۱۱۹ - ۱۱۸)

یہ حکایت امیر خسرو ہی خاص طور سے قلمبند کر سکتے تھے، کیونکہ ان کے دل میں ہندو ملک کی جو محبت بھری تھی، اس کا اظہار انھوں نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں کیا (تفصیلات کے لیے دیکھو میرا رسالہ "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں")

سلطان شہاب الدین غوری یعنی سلطان معزالدین سام کے کردار کے متعلق ایک سبق آموز روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں اس طرح بیان کی گئی ہے،

فرمایا کہ سلطان معزالدین محمد سام انار اللہ برہانہ کی عادت تھی کہ جب کوئی بوڑھا آدمی اس کے پاس آتا تو وہ تخت سے اٹھ جاتا، کھڑا رہتا اور

ان کی باتیں پوری کرتا، وزرا نے عرض کیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں کہ وہ کھڑے ہو جائیں، سلطان نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ اس کا مقصد کیا ہے، انھوں نے جواب دیا ہم کیا جانیں، حضرت خلیفہ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا کہ میں سفید بال کی عزت میں اٹھ جاتا ہوں تا کہ کل قیامت کے روز میرا حشر مسلمان بوڑھوں کے ساتھ شاید ہو جائے، اور دوزخ کی آگ سے نجات ہو، حق تعالےٰ نے سفید بالوں میں اپنے نور کا اضافہ کیا ہے، اس نور کی عزت سے شاید میری نجات بھی ہو جائے، (قلمی نسخہ ص ۲۸)

جامع الحکایات ولوامع الروایات مرتبہ سدید الدین محمد عوفی میں شہاب الدین غوری کے کردار کی خوبیوں کے متعلق کچھ ایسی ہی روایتیں ہیں۔

سلطان شمس الدین التتمش کی سیرت سے متعلق بھی افضل الفوائد میں ایک روایت ہے، جو فوائد الفواد میں بھی ہے، دونوں کی عبارتیں یہ ہیں۔

افضل الفوائد	فوائد الفواد
فرمود کہ سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ را رسم بود کہ نیم شب در عبادت مشغول شدے، و آن زمان کہ برخاستے خود آب بستدی و وضو کردے و ہیچکس را از بندگان بیدار نہ کردے تا وقتے ازیں حال سوال کردند فرمود چرا باشد کہ رنج بر دیگرے نہیم و ایشاں	از عقیدۂ خوب او (التتمش) فرمود کہ شبہا بیدار بودے و چوں از خواب بیدار شدی وضو ساختے، دوگانہ گزاردی و باز در خواب شدے و ہیچ کس را بیدار نہ کردے

افضل الفوائد	فوائد الفواد
را از خواب بیدار کنیم (ص ۲۶)	

اوپر کے دونوں اقتباسات لفظ بہ لفظ نہیں ہیں، معناً یکساں ضرور ہیں، ممکن ہے کہ یہ روایت امیر خسرو کے سامنے بھی دہرائی گئی ہو، پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی باتیں نہ ہوتیں تو کہا جاتا کہ افضل الفوائد میں وہ موضوعات نہیں ہیں، جو فوائد الفواد میں ہیں، اور اگر ایسی باتیں پائی جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے، کہ فوائد الفواد ہی کے مضامین دہرا دیے گئے ہیں،

اگر افضل الفوائد پر یہ اعتراض ہے کہ اس سے اس عہد کے سیاسی حالات پر روشنی نہیں پڑتی ہے، (ص ۸۳) تو یہ اعتراض فوائد الفواد پر بھی کیا جا سکتا ہے، مگر ملفوظات کے مجموعے تاریخ کی کتابیں نہیں ہوتی ہیں، جن میں سیاسی، سماجی، اور معاشی مواد کا ہونا ضروری ہو، ضمناً ایسی باتیں آجاتی ہیں، تو ان سے معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں، ورنہ ان میں زیادہ تر مذہبی اور روحانی باتیں بیان کی جاتی ہیں، اگر کبھی ان میں معاشرہ سے متعلق باتیں آجائیں تو یہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس زمانہ کے معاشرہ کو سنوارنے کے لیے یہ باتیں کہی گئی ہیں، افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مجلس میں یہ بیان کیا گیا کہ آسمان سے بڑی چیز بہتان تراشی اور دروغ گوئی ہے، زمین سے بھی فراخ تر چیز سچائی کا اعلان ہے، اور دریا سے زیادہ تونگر چیز خردمند کا قول ہے، اور آگ سے بھی زیادہ گرم چیز مردم حریص کا قول ہے، اور زہر سے زیادہ سرد چیز یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں، قرابت مندوں، اور دوستوں کی حاجت روائی نہ کر کے ان کو نا امید کیا جائے، اور پتھر سے زیادہ سخت کافروں کا دل ہے، اور یتیموں سے زیادہ خوار تر چیز چغل خوری ہے، تمام

گناہوں میں بہتان باندھنے سے زیادہ سخت اور زیادہ ہولناک کوئی اور گناہ نہیں ہے۔ (ص ۲۴۴) کیا ان ملفوظات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے، کہ اس زمانے کے معاشرہ کے بعض حلقہ میں بہتان تراشی، دروغ گوئی، اور رشتہ داروں کی حاجت روائی سے بے اعتنائی، اور چغل خوری وغیرہ رائج تھی، یہ ساری باتیں ان کی اصلاح کے لیے کہی گئی ہیں،

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں میں شرم، حیا، اور عفت کا معیار گر گیا تھا، گانا بجانا زیادہ ہونے لگا تھا، علماء بے عمل ہوگئے تھے، مغنی، مطرب، مسخرے اور اہل فساد بڑھ گئے تھے، اور ان کی سرپرستی ہونے لگی تھی، مرد رنگین کپڑے پہننے لگے تھے، حاکم حکم کو فروخت کرنے لگے تھے، دنیا کے مال کی خاطر حق کو ناحق قرار دیا جانے لگا تھا، معاشرہ کی ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر حضرت خواجہ نے حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا کہ جب ایسی باتیں ہونگی تو زمین سے اگنے والی نباتات میں برکت نہ ہوگی، آسمان سے بارش کم ہوگی، اور اگر ہوگی تو بے وقت ہوگی، (ص ۱۴۸) ایسی حدیثیں ترمذی ابواب الفتن اور بخاری و مسلم میں ملیں گی، (دیکھو مشکوٰۃ جلد ۳ ص ۲۲-۲۱)

حدیث اور ملفوظات کی باتیں جب باضابطہ ملائی جائیں گی تو یہ ضروری نہیں کہ ملفوظات میں حدیث کی باتیں لفظاً بہ لفظ دہرائی گئی ہوں، وہی فرق ہوگا، جو کتاب کو دیکھ کر پڑھنے اور کسی بات کو زبانی دہرانے میں ہوگا، مجلس میں زبانی باتیں کہنے کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے کہنے میں بعض اوقات کچھ باتیں اس طرح بڑھ جاتی ہیں یا کم ہوجاتی ہیں کہ اصل سے مختلف ہوجاتی ہیں، مگر مفہوم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، ان میں جو مفید باتیں ہوں، ان سے درس حاصل کیا جائے، نہ کہ تحقیقات کے پردے میں

ہر قسم کی خامیاں دکھائی جائیں، آج کل بھی بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں، جن میں ایک عیب جو ہر قسم کی خامیاں دکھا سکتا ہے، مثلاً مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے ایک وعظ میں نصاب الاحتساب کے مصنف قاضی ضیاء الدین سنامی اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی ایک حکایت سنائی، جو انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے الہ آباد میں سنی، ان بزرگ نے یہ حکایت اپنے کسی بزرگ کی کسی کتاب سے نقل کی ہے، اور وہ ایسے بزرگ تھے جن کو حضرت خضر علیہ السلام ملا کرتے تھے، ان کے یہاں ایک کتاب حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے، شاید انھوں نے حاشیہ کے طور پر کوئی فائدہ لکھنا چاہا تھا، مگر ف لکھ کر آگے نہیں لکھ سکے، وہ کتاب تبرک کے طور پر ان کے کتب خانہ میں رکھی ہوئی ہے، ان ہی بزرگ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور قاضی ضیاء الدین سنامی کی یہ حکایت سنائی۔

"قاضی صاحب (یعنی قاضی ضیاء الدین سنامی) کا وقت وصال سلطان جی (یعنی حضرت سلطان الاولیا خواجہ نظام الدین اولیا) سے پہلے آیا، سلطان جی انکی عیادت کو گئے دروازہ پر پہنچ کر اجازت مانگی، قاضی صاحب نے فرمایا سلطان جی سے کہدو کہ یہ وقت وصال حق کا وقت ہے، اس میں بدعتی کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا سلطان جی نے جواب دیا کہ قاضی صاحب سے عرض کردو کہ وہ بدعتی ایسا بے ادب نہیں کہ بارگاہ سنت میں بدعت سے ملوث ہوکر آتا، وہ حضرت والا کے مذاق سے واقف ہے، اور آپ کے مذاق کی پوری رعایت کرکے حاضر ہوا ہے، میں اس بدعت سے توبہ کرکے حاضر ہوا ہوں، یہ جواب سن کر قاضی صاحب پر حالت

طاری ہوگئی، اور آبدیدہ ہوکر اپنا عمامہ سر سے اتار کر خادم کو دیا کہ سلطان جی سے کہو کہ اس عمامہ پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں، بس ان میں ایک کسر تھی جو جاتی رہی، باقی ان کے مقامات عالیہ اور کمالات سے میں ناواقف نہیں ہوں،

گر بہ سر دیدہ چشم من نشینی　　　نازت بکشم کہ نازنینی

خادم قاضی صاحب کا عمامہ لے کر سلطان جی کے پاس حاضر ہوا، تو آپ نے عمامہ کو سر پر رکھ لیا کہ یہ عمامۂ شریعت ہے، اس کو اپنے سر پر رکھ کر حاضر ہونگا، چنانچہ تشریف لائے اور قاضی صاحب نے فرمایا۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند　　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حضرت اب میرا آخری وقت ہے، اور میرے اوپر توجہ فرمائیے، چنانچہ حضرت سلطان جی نے توجہ شروع کی اور ایسی توجہ کی کہ قاضی صاحب کی روح نہایت فرح وشادانی کے ساتھ عالم بالا کو پرواز کر گئی، حضرت قاضی صاحب کا وصال ہوگیا تو سلطان جی روتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ افسوس شریعت کا ستون گر گیا،

اس حکایت کو ذکر کرکے وہ بزرگ فرماتے ہیں، کہ نہ میں نظام الدین ہوں جو اجازت دوں نہ ضیاء الدین ہوں کہ جو منع کروں یہ حکایت میں نے اخبار الاخیار میں دیکھی ہے مگر مختصر۔ تو حضرت یہ تھا ہمارے سلف صالحین کا طریقہ امر بالمعروف میں کہ ایک دوسرے کا ادب کرتے تھے، اور نصیحت بھی کرتے تھے، (الحدود والقیود ص ۳۹)

یہ حکایت اخبار الاخیار سے لی گئی ہے، جس میں مولانا ضیاء الدین سنامی کے تذکرہ میں اس طرح درج ہے۔

"مولانا ضیاء الدین سنامی دیانت اور تقویٰ میں مقتدائے وقت تھے، شریعت کی پابندی میں بڑے راسخ تھے، شیخ نظام الدین اولیاؒ کے معاصر تھے۔ ان سے سماع سے متعلق احتساب کرتے، شیخ ان سے معذرت کرتے ہوئے، ان کی تعظیم میں کوئی فروگذاشت نہ کرتے، ان کی ایک کتاب نصاب الاحتساب ہے، جو بدعت کے دقائق اور احتساب کے ساتھ احکام شریعت پر مشتمل ہے، شیخ نظام الدین اولیاء مولانا ضیاء الدین کے مرض الموت میں ان کی عیادت کو گئے تو مولانا نے اپنی دستار شیخ کے قدموں میں ڈالدی شیخ نے دستار کو اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا، اور جب وہ مولانا کے پاس بیٹھے تو مولانا آنکھیں چار نہ کر سکے، جب شیخ اٹھ کر باہر آئے تو مولانا کی وفات کی خبر گونجی، شیخ رونے لگے اور افسوس کرتے ہوئے کہا کہ شریعت کی حامی ایک ذات تھی، وہ نہ رہی، رحمۃ اللہ علیہما،

(اخبار الاخیار ص ۱۰۲-۱۰۱)

اخبار الاخیار کی روایت کیا تھی، اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ میں محض اثر پیدا کرنے کے لیے کیا سے کیا کر دی گئی، اب کوئی عیب جو اور خردہ گیر مولانا تھانوی کی روایت کو جعلی اور فرضی قرار دے تو اس کا کیا علاج ہے،

افضل الفوائد میں حقوق ہمسایہ، عبادت، بیمار پرسی، دل جوئی، رواداری، اور نفس کشی وغیرہ پر بہت سے ملفوظات ملیں گے، جو احادیث یا بزرگان دین کے عمل کی روشنی میں بیان کیے گیے ہیں، ان میں جو تعلیم و تلقین کا رنگ ہے، اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے معاشرہ میں یا تو اس کی کمی تھی، جن کو پورا کرنے کا جذبہ تھا، یا یہ اوصاف موجود تھے، تو ان کو اور بہتر طریقہ سے سنوارنے کی کوشش تھی۔

فضل الفوائد پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس میں تصوف اور مذہب کی کتابوں کے حوالے کثرت سے شک انگیز حد تک آئے ہیں، ان میں کچھ کتابیں اوراد و وظائف کے مجموعے ہیں کچھ تصوف، کچھ فقہ اور کچھ تفسیر کی کتابیں ہیں، تفسیر کشاف، تفسیر امام زاہدی، تفسیر امام ناصری، تفسیر امام مجاہد، تفسیر خواجہ شفیق بلخی کے حوالے ہیں، پھر خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کی دو کتابوں راحت الارواح اور لوائح کے بھی نام آئے ہیں، ایک تصنیف تحفۃ العارفین کا بھی ذکر ہے۔

(ص ۲۰۸) ان کتابوں کے نام آنے کی وجہ سے فضل الفوائد کو جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی مجلسوں میں ان کتابوں کے حوالے نہ آتے تو اور کن کتابوں کا ذکر آتا، خود فوائد الفواد میں احیاء العلوم، الکتاب، ایجاز التفسیر امام ناصری، جوامع الحکایات، روح الارواح، شافی، صحیحین، طبقات ناصری، قوت القلوب، کشاف، کشف المحجوب، لوائح، مخ المعانی، مرصاد العباد، مشارق الانوار، مکتوبات عین القضاۃ ہمدانی، نافع، نوادر الاصول اور ہدایہ کا ذکر ہے، فوائد الفواد میں خواجہ فریدالدین عطارؒ کا نام آتا ہے، مگر تذکرۃ الاولیاء کا ذکر نہیں اگرچہ اس سے بہت سی باتیں لی گئی ہیں، فضل الفوائد میں تو دلیل السالکین، کتاب العارفین، اور انیس الانس کے بھی حوالے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتابیں، اس زمانہ میں رائج تھیں، اور جب فضل الفوائد میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ

"در اوراد خواجہ یعنی شیخ الاسلام خواجہ عثمان ہرونی دیدہ ام"

"در اوراد شیخ قطب الدین بختیار اوشی بنشستہ دیدہ ام" فرمود کہ شیخ معین الدین سجزی در اوراد خود این بنشستہ"

"فرمود کہ در اوراد شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز بنشستہ دیدہ ام"

کیا یہ سب فرضی ہیں؟ کیا شروع کے خواجگانِ چشت کی تعلیمات کہیں قلمبند ہی نہیں ہوئیں؟ کیا ان بزرگانِ دین کے حالات اور خیالات صرف فوائد الفواد اور سیر الاولیاء ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں، محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ ملفوظات دوسری کتابوں کو سامنے رکھ کر وضع کر لیے گئے ہیں (ص ۲۰۷)، جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ یہ ملفوظات کن کن کتابوں سے ماخوذ ہیں، محض قلم کے زور سے ان کو فرضی قرار دینا صحیح نہیں، یہ کہہ دینا بھی کافی نہیں کہ ان ملفوظات میں معمولی مضامین ہیں، اور ان میں زیادہ تر قصص الانبیاء ہیں، فوائد الفواد میں بھی حضرت حوا، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، اور ہود علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا ذکر ملے گا، اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک سے تو کتاب بھری ہوئی ہے، اور جس طرح فضل الفوائد میں خواجہ ذوالنون مصری، خواجہ فضیل عیاض، حضرت ابراہیم ادھم، خواجہ ابو تراب نخشبی، خواجہ جنید بغدادی، خواجہ ابوبکر شبلی، شاہ شجاع کرمانی، خواجہ عبداللہ سہیل تستری، شیخ شہاب الدین تستری، داؤد طائی، ابو سلیمان، رابعہ بصری اور حسین منصور حلاج کا ذکر ہے، اسی طرح فوائد الفواد میں ابراہیم ادھم، شیخ ابو الاسحاق گازرونی، خواجہ اجل شیرازی، شیخ احمد معشوق، حضرت بایزید بسطامی، خواجہ شاہی موتاب، شیخ شبلی، شیخ علی ہجویری، اور شیخ یوسف ہمدانی کا ذکر ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ فضل الفوائد اور راحت المحبین میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ یا آپ کے شیوخ یا معاصرین کے بارے میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں نہ ملتا ہو یا اس کتاب میں زیادہ صحت و وضاحت

یا جزئی تفصیلات کے ساتھ درج ہو، (ص ۲۸) اگر افضل الفوائد کے مستند ہونے کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے، کہ اس میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ، اور ان کے مرشد کے متعلق ایسی روایتیں ہوں جو دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں نہ ملیں تو ایسی بہت سی روایتیں افضل الفوائد میں مل جائیں گی، کچھ مثالیں یہ ہیں،

ایک مجلس جاری تھی کہ حسن سجزی اور خواجہ عزیز ایبک آگئے، یہ ندیم خاص میں تھے، دونوں نے حضرت خواجہ کے سامنے اپنے سروں کو زمین پر رکھا، خواجہ پر غلبہ طاری تھا، ان پر بڑی شفقت فرمائی، کہا کہ بیٹھو، پھر خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے عزیز سے کہا کہ ایک غزل سناؤ کہ حق تعالے نے اس وقت تم کو یہاں بھیج دیا ہے، خواجہ عزیز نے جب غزل شروع کی تو خواجہ عزیز اور تمام مجلس والوں پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ یہ وہم اور فہم میں نہیں آسکتی، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اپنا خاص جامہ خواجہ عزیز اور برادرم حسن کو عطا کیا، اس طرح اس روز سعادت پر سعادت حاصل ہوئی، خواجہ عزیز نے جو غزل سنائی وہ یہ تھی، میرے پیش نظر قلمی نسخہ میں اشعار جس طرح درج ہیں اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں،

گر پردہ برکشائی ازاں رُی در بہشت روشن شود بہ اہلِ نظر جانِ خوب و زشت
گل را صفت کنم مہ و خورشید را اگر اے ہر کہ خوب خوب بہ پیش تو زشت زشت
رضواں اگر بہ بیند خشت درت کنند جملہ نگارخانۂ فردوس خشت خشت
کاغذ ز گریہ تر شد و خامہ ز آہ سوخت حالِ دلِ خراب بگو چوں توان نبشت
کشت امید گشتم د تو ابر رحمتی بگذر دگشت زار کو رست کشت کشت
چندیا حسن برشیہ جاں دل چہ بستہ سلطت اگر گسست زہی سرشت رشت

یہ امیر حسن سجزی ہی کی غزل ہے، مگر ان کے مطبوعہ دیوان میں مذکورہ بالا اشعار دو علحدہ علحدہ غزلوں میں درج ہیں، معلوم ہوتا ہے، کہ عزیز ایبک نے دونوں غزلوں کے کچھ اشعار کو لے کر ایک ساتھ لگا دیا، اور بقیہ اشعار کو چھوڑ دیا، میرے پیش نظر قلمی نسخہ میں اشعار کی کتابت میں بڑی غلطیاں ہیں، مطبوعہ نسخہ میں مطلع کا پہلا مصرع اس طرح ہے، ع:-

گر پردہ برکشائی ازاں روے چوں بہشت

قلمی نسخہ میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے، ع

گر پردہ برکشائی ازاں روے در بہشت

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں مہ و خورشید را اگر کے بجاے مہ و خورشید را اگر ہے، اسی کے دوسرے شعر میں اے ہر کہ کے بجاے اے آنکہ ہے، تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں رضواں اگر بہ بیند (؟) ہے، چوتھے شعر کا دوسرا مصرع مطبوعہ نسخہ میں بالکل بدلا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے:-

ع شرح فراق خویش بتو چوں تواں نوشت

پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ نسخہ میں کشت امید کے بجاے تخم امید ہے، اور دوسرا مصرع یہ ہے،

بگذر بکشت زار کہ زارست حال کشت

آخری شعر کے پہلے مصرع میں چند اے حسن بریشہ جاں کے بجاے مطبوعہ نسخہ میں چندیں حسن برشتہ جاں ہے، اور اس کا دوسرا مصرع اس طرح ہے،

ع سہلت گر گست چہ شد مرہمش سرشت

کتابت کی ان غلطیوں کو نظر انداز کر کے اس مجلس میں جو کیفیت طاری ہوئی اس کے ایسا نقشہ فوائد الفواد میں نہیں ملتا، اسی طرح افضل الفوائد میں ہے کہ ایک موقع پر فرمایا کہ میں نے قصص الانبیاء میں لکھا ہوا دیکھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس قدر روتے تھے کہ اُن کے گوشت پوست اور رخسار کی ساری چیزیں بہہ گئی تھیں، آپ سے پوچھا گیا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں، جواب دیا کہ میں کیا کروں، کہ میرا یہ دیدہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے، جن کو نہ دیکھنا چاہئے، میں حق تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو اس کے لئے بخش دے، جب خواجہ ذکر اللہ بالخیر نے یہ حکایت بیان کی تو حسن سجزی مجلس میں حاضر تھے، وہ جھکے اور عرض کیا کہ اسی بات کو میں نے چند مصرعوں میں ادا کیا ہے، اگر حکم ہو تو عرض کروں، فرمایا سناؤ، وہ اشعار یہ ہیں :-

شبے آن چشم مست وآں لب خونخوار را دیدم

زگریہ چشم من خوں شد پشیمانم چرا دیدم

ندیدا ایں چشم من بر سر زلف بلا شوری

ازیں چشم پریشاں ہیں ہمیشہ ایں بلا دیدم

مرا گفتند سوے او مبیں دیدم بلا کردم

بہ خوش گفتند روے او مبیں دیدم جفا دیدم

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے ان اشعار کو سُن کر بڑی تعریف کی (ص ۳۸-۳۷)

اوپر جن دونوں مجلسوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان دونوں میں امیر حسن سجزی موجود تھے

مگر انھوں نے اپنی فوائد الفواد میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کو امیر خسرو قلمبند کر رہے ہیں، پھر ان کو اپنی فوائد الفواد میں کیسے ذکر کرتے، حسن سجزی کے مطبوعہ نسخہ میں مذکورۂ بالا غزل ہے، جس میں چھ اشعار ہیں مگر افضل الفوائد میں صرف تین ہی اشعار حسب مطلب نقل کیے گئے ہیں، اوپر کے دوسرے شعر میں کتابت کی بھونڈی غلطیاں ہیں، اس کا پہلا مصرع مطبوعہ دیوان میں اس طرح ہے،

ندید این چشم من جز در سر زلف بلا شورش

اب کتابت کی ان غلطیوں کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ یہ شعر جعلی ہے تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا، اسی طرح آخری شعر کا دوسرا مصرع مطبوعہ نسخہ کے مصرع سے بالکل مختلف ہے، مطبوعہ نسخہ میں یہ مصرع اس طرح ہے،

مرا گفتند گفت دل مکن کردم سزا دیدم

اس اختلاف سے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، ایک تو یہ کہ یہ سب کچھ جعلی اور فرضی ہیں، یا یہ کہ یہ کتابت کی غلطیاں ہیں یا یہ کہ ملفوظات قلمبند کرنے میں سہو ہو گیا ہو، اس کے بعد تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بہت سی غلطیاں اور ہونگی جن کو دیکھ کر یہ فرضی بات گڑھنے میں آسانی ہو گئی کہ یہ ملفوظات جعلی ہیں،

اگر ذہن صاف ہو تو اوپر کی جن دو مجلسوں کی پرکیف باتوں کا ذکر آیا ہے، ان میں ایسے نکتے پیدا کیے جا سکتے ہیں، جو اور دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں نہ ملیں گے، ایسے ہی نکتے اور مجلسوں میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً

ایک بار عشق پر کچھ باتیں نکل پڑیں تو خواجہ ادام اللہ برکاتہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں اور یہ شعر زبان پر لائے ؎

فلولا کم ما عرفنی الهوی
ولولا الهوی ما عرفناکم

پھر شوق و اشتیاق (یعنی جذبۂ عشق) سے مغلوب ہو کر یہ دو شعر پڑھے

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی
چندیں سخن عشق کہ گفتی کہ شنودی

گر باد نبودی سر زلفش کہ ربودی
رخسارۂ معشوق بہ عاشق کہ نمودی

ایک دوسری مجلس میں ہے کہ خواجہ کی چشم پُر آب ہو گئی، اور فرمایا کہ عشق کا سرمہ ایسا سرمہ ہے کہ اگر یہ آنکھوں میں لگا لیا جائے تو فرش سے عرش تک کوئی حجاب نظر نہیں آئے، پھر یہ دو مصرعے زبان مبارک پر لائے، (ص ۳۹)

عشق آئینۂ ایست کاندر وزنگی نیست

نامردان را ازیں گل رنگی نیست

اگر یہ ساری باتیں لفظ بہ لفظ کسی اور مجموعۂ ملفوظات میں پائی جائیں تو پھر یہی سمجھا جائیگا کہ یہ ملفوظات مسروقہ ہیں، ورنہ یہ سمجھنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ یہ باتیں ایک عارف باللہ ہی کی زبان سے نکل سکتی ہیں، اور ایک صاحب دل ہی ان کو قلمبند کر سکتا ہے، ورنہ ایسی مجلسوں سے دور رہ کر کوئی محض ملفوظات کے ایک مجموعہ کو فروخت کرنے کی خاطر نہیں لکھ سکتا،

(باقی)

جمالی

لودی اور مغل دور کا شاعر

(۲)

از ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم، مترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ

مثنوی مرأۃ المعانی یہ مثنوی شش رکنی بحرِ رمل مقصور میں لکھی گئی ہے۔ اس میں سات سو اشعار ہیں۔ اس میں تصوف کی مختلف منزلوں کا بیان ہے۔ اس کے دو مخطوطات کا سراغ ملتا ہے ایک پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا حبیب گنج کتب خانہ، علی گڈھ میں[1]۔

اس کی ابتدا حمد[2] سے ہوتی ہے پھر نعت[3] ہے اور نعت کے بعد شیخ سماء الدین کی منقبت[4] اور پھر مقصدِ تصنیف[5]۔

[1] مقالات شیروانی صفحہ ۳۱۲ تا ۳۱۴ (اورینٹل کالج میگزین شمارہ نومبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۴ تا ۱۴۷ مصنفہ ایچ۔ آر۔ کے شیروانی بھی دیکھئے [2] مرأۃ المعانی پنجاب یونیورسٹی (مخطوطہ) ورق ۱۱ الف تا ۱۲ الف [3] ایضاً ورق ۱۲ الف تا ۲ ب [4] ایضاً ۳ ب تا ۴ ب [5] ایضاً ۴ ب تا ۵ ب

مثنوی کی ابتداء سراپا سے ہوتی ہے[1] .. جامی کا خیال ہے کہ جسم کے حصے محض مادی کام انجام دینے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ ان کے کچھ روحانی کام بھی ہیں، سراپا میں جن اعضا کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہیں "رو، رخسار، خط ابرو، چشم، دہن، لب، زنخداں، زلف، خال، گیسو، ساعد، قامت اور کمر" اس کے بعد تصوف میں مستعمل مختلف اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے جیسے کفر، میخانہ، مے فروش، رند قلاش، صبر اور تسلیم وغیرہ -

سببِ تصنیف | جامی نے اس کا سبب تصنیف خود ہی بیان کیا ہے[2]، وہ کہتا ہے کہ اکثر اس سے پوچھا جاتا تھا کہ تصوف میں "زلف، خد و خال، روی و موی، گیسو، چشم و ابرو، قد، کمر، دہن، خط و ذقن، شاہد، ساقی و جام بت و بتخانہ اور زنار کی کیا اہمیت ہے" اسی لیے اس نے یہ مثنوی لکھ ڈالی، تاکہ سائل اسے پڑھ کر خود ہی اپنے سوالوں کے جواب پا لے اور ایسے سوالات اس سے بار بار نہ پوچھے جائیں اور اسی لیے اس مثنوی کا نام اس نے مراۃ المعانی رکھا ہے[3] وہ کہتا ہے

هرچه بود از آشکار و از نهان	اصطلاحِ عارفان کردم بیان
اندر رخ معنی حجاب انداختیم	انچه پنهان بود پیدا ساختیم
نامه را چوں روشنائی بر فزود	گشت مرآتے که روئے حق نمود
چوں معانی کرد حق الهام او	گشت مرآۃ المعانی نام او

مثنوی کا اختتام "خاتمہ" پر ہوتا ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں

منتِ ایزد که در بحرِ عظیم	آشنا گشتیم بے دُرِ یتیم

[1] مراۃ المعانی ۵ ب تا ۱۱ الف [2] ایضاً ۴ ب تا ۵ الف [3] ایضاً ۵ الف تا ۵ ب

اندر آں دریائے پر خوں بے درنگ	خویش را انداختیم مثلِ نهنگ
غوطه خوردن، همچو غواصانِ دور	مشکلِ خود ساختیم آسان و دور
عین معنی چوں صدف بشگافتیم	گوهر اسرارِ حق دریافتیم
اے جامی جمله دریا نوش باش	چوں صدف پُر در شو و خاموش باش

اس مثنوی سے محض اتنا ہی پتہ نہیں چلتا کہ جامی کو زبان پر قدرت حاصل تھی بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تصوف کے جملہ مسائل سے کما حقہٗ واقف تھا۔ اس نے شستہ، سلیس، دلکش اور مسحور کن زبان استعمال کی ہے۔ تصوف کے جن مسائل کا اس میں ذکر ہے، ان پر بحث کرنے کے لیے ادق الفاظ اور مشکل اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے لیکن جامی ان مراحل کو آسانی کے ساتھ طے کر گیا ہے۔ چند شعر مثالاً درج کیے جاتے ہیں جن سے زبان و بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حمد

نامه آغازم بنامِ ذوالجلال	آں که بیروں ذاتش از وهم و خیال[1]
جانِ عالم پرتوِ انوارِ اوست	عرشِ اعظم نقطۂ پرکارِ اوست
صانع هفت و نه و پنج و چهار	خالق ماه و خور و لیل و نهار
عالمِ اعیان که آیاتِ ویست	حرفهائے مصحف ذات ویست

نعت

احمد مرسل که محبوبِ خداست	در صفِ اول امام انبیاست[2]
گوهر بحرِ صفات و ذات اوست	بیگماں مقصود موجودات اوست

[1] مراۃ المعانی ورق ۱ الف [2] ایضاً ورق ۲ الف تا ۲ ب

گر نہ بودے ذاتِ آں عالی صفات	در عدم ماندے وجودِ کائنات
از پس توحید و نعتِ مصطفٰے	برکشایم مدح پیر با صفا[1]
زانکہ اول واجب آمد بر مرید	تا بسازد نام پیر خود پدید
چوں کلید نام پیر آمد بدست	برکشاید ہر قفل گنجے کہ ہست
ہر کہ اول ذات پیر خود شناخت	با خدا آخر تواند عشق باخت
ہر کہ از عاشق نہ شد برروئے پیر	با خدا ہرگز نہ شد نعمت پذیر
ہست چشم اینجا بمعنی نقشِ ذات	کہ عیاں بنید وجود کائنات[2]
ہست گیسو راہ او دور و دراز	ہر کہ اینجا شد نشد بر خویش باز[3]
ساعد آمد قدرتِ دانائے راز	می کند ہر سو کہ می خواہد دراز[4]
کفِ در فقر و فنا کوشیدن است	خویشتن را در فنا پوشیدن است[5]
مے فروشی اینجا بمعنی مرشد است	ہر کہ او مرشد نہ دارد ملحد است[6]
رندی این جا عالم بے باکی است	در طریقت چستی و چالاکی است[7]

مثنویاتِ جمالی | مختلف کیٹلاگ[8] میں درج ذیل مثنویات بھی جمالی کے نام سے منسوب ہیں:
(الف) بیان حقائق احوال سید المرسلین (ب) محبوب الصدیقین (ج) مہر القلوب

[1] مراۃ المعانی ورق ۲ ب [2] ایضاً ورق ۷ الف [3] ایضاً ورق ۹ ب [4] ایضاً ورق ۱۱۰ الف [5] ایضاً ورق ۱۱۲ الف [6] ایضاً ورق ۱۱۳ ب [7] ایضاً ورق ۱۱۳ الف [8] کیٹلاگ آن پرشین مینو اسکرپٹ آن ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد اول صفحہ ۲۸۳ تا ۲۸۶ بوہار لائبریری جلد اول صفحہ ۲۳ تا ۲۶ شاہانِ اودھ کا کتب خانہ صفحہ ۴۴ تا ۴۷ بوڈلین لائبریری صفحہ ۴۸۷ تا ۴۸۸

(د) کشف الارواح (ہ) فرحت نامہ (و) نصرت نامہ (ز) قدرت نامہ (ح) فضیلت العقل (ط) نورٌ علی نور۔

الف۔ بیان الحقائق احوال سید المرسلین[1] | یہ مذہبی مثنوی مفصل اور جامع ہے۔ اس کی بحر شش۔ کنی رمل محذوف ہے۔ مولانا روم نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی اسی بحر میں لکھی ہے۔ اس کے سات حصے ہیں اور ہر حصے کا نام جداگانہ رکھا گیا ہے۔ اختتام پر کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصباح الارواح اس کا پہلا[2] اور شہر الواصلین اس کا ساتواں اور آخری حصہ ہے[3]، باقی حصے یا تو دستیاب نہیں یا جمالی کے نام سے منسوب دوسری مثنویات میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس نکتہ پر آگے بحث آتی ہے۔

۱۔ پہلا حصہ مصباح الارواح | یہ بیان الحقائق کا پہلا حصہ ہے۔ اس کی تکمیل[4] ۲۰ صفر المظفر ۸۹۷ھ / ۱۴۹۲ء کو ہوئی

ماندہ بدہ روز از ماہ صفر | کیں فلک گردید با شمس و قمر
ہشت سال و شصت سالی و ہشت	رفتہ بعد از ہجرت شاہ رصد

[1] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ نمبر ۶۸۴ کیٹلاگ صفحہ ۲۸۳ [2] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مخطوطہ جلد اول ورق ۱۷۶ الف تم القسم الاول من بیان حقائق احوال سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و قد سمی ھذا القسم بمصباح الارواح والحمد للہ رب العالمین [3] ایضاً جلد دوم ورق ۱۰۸ ب تم الکتاب المسمی بشہر الواصلین و با تمامہ تم الاقسام السبعۃ الموعودۃ حسن الکتاب الوارد فی بیان حقائق احوال المصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والحمد للہ رب العالمین [4] ایضاً جلد اول ورق ۱۷۶ الف

یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی احادیث پر مشتمل ہے۔ اس میں قرآنی آیات کے حوالے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سمجھانے کے لیے کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس میں رسول اللہ ؐ کی احادیث اور حضرت علیؓ کے اقوال نثر میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ کچھ عربی اشعار بھی ملتے ہیں[۱]

اس میں رسول اللہ ؐ کے ذکر کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے[۲]

ز انکہ بے مصباح ننماید جمال — حسن خوباں در جبین بے مثال
ذکر نور مصطفیٰ در منزلات — فاش بنمودم دریں ذات وصفات

مصباح الارواح مصنف کی پہلی کتاب نہیں۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس ضخیم کتاب کی تصنیف سے پہلے وہ تیرہ[۳] کتابیں لکھ چکا ہے۔

بعد از مصباح روح عاشقاں — شعلہ افروزد دریں مشکات جاں

ان تیرہ کتابوں کے نام اس نے (حصہ اول ورق ۱۶۷ تا ۱۷۵) خود تحریر کیے ہیں جو درج ذیل ہیں،

(۱) مرأت (۲) کنز دقائق (۳) روح القدس (۴) تنبیہ (۵) محبوب (۶) کشف الارواح (۷) مفتاح فتوح (۸) ملمعات (۹) غزل (۱۰) مستزاد (۱۱) قصائد (۱۲) ترجیعات (۱۳) میزان حقائق

ان کی ضخامت کے پیش نظر مشکل ہی سے انہیں کتاب کہا جا سکتا ہے۔

---

۱ مرأۃ المعانی جلد اول ورق ۱۵ الف ۲ مثنویات جمالی مخطوطہ (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)، جلد اول ورق ۱۶۷ الف
۳ ایضاً ورق ۱۷۵ اب

(ب) ساتواں حصہ شرح الواصلین، اس کا پورا نام شرح الواصلین وسیف الباطلین وشہید المرفیتین وسم الغافلین ہے[۱]۔ اسپرنگر (SPRENGER) نے اس کا نام شرح الواصلین وسم الغافلین وشہید المرفیتین وسیف الباطلین لکھا ہے۔ ایوانوف (IVANOW) نے اپنے کیٹلاگ میں اس کا نام "شرح الواصلین وتوصیف الباطلین" لکھا ہے جو غلط ہے۔ اس حصے کا پورا نام مخطوطہ حصہ دوم ورق ایک اور ۲ الف (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ ایوانوف کی نظر سے یہ مخطوطہ گذر چکا ہے، پھر بھی وہ غلطی کر گیا۔ علاوہ ازیں "توصیف الباطلین" مفہوم کے لحاظ سے بھی بے معنی ہے[۲]

یہ حصہ ۳۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل ۸۷۰ھ (۱۴۶۵-۶۶ع) میں ہوئی[۳]

چونکہ شرح الواصلین آمد تمام یافت — دل زمین یار جام کام یافت
مہر باید کرد بر نام حبیب — تا شود تاریخ درپیغام غریب
ہجرت آں درد نوش وصاف کش — بود اندر ہشت صد وہفتاد وشش
(۸۷۶)

اس کی زبان وبیان مصباح الارواح کی زبان وبیان جیسی ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت علیؓ کی دل کھول کر تعریف کی گئی ہے۔

چونکہ شرح الواصلین است ایں کتاب — دا تمایم حسن ماہ وآفتاب
از محمد گویم واز آل او — وز علی بو طالب واقبال او

---

۱ مثنویات جمالی جلد دوم ورق ایک اور ۲ الف ۲ کیٹلاگ آف لائبریری آف اودھ صفحہ ۶۴۴ ۳ مثنویات جمالی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد دوم ورق ۱۸۸ اب ۴ ایضاً ورق ۱۸۸ اب

مصنف پہلے ایک یا دو حدیث لکھتا ہے پھر اس کا فارسی ترجمہ کرتا ہے پھر نثر میں اس کی تشریح کرتا ہے اور اشعار میں دلائل پیش کرتا ہے۔ اس میں شیعہ اماموں اور درویشوں کے اقوال ناصحانہ اور صوفیانہ انداز میں نقل کیے گئے ہیں۔

(۵) دوسرے حصے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مصباح الارواح (مثنوی کا پہلا حصہ ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء) میں اور ساتواں اور آخری حصہ شرح الواصلین ۸۷۶ھ/۱۴۷۲ء میں مکمل ہوا اس سے ظاہر ہے کہ دوسرے حصے (دوم سے ششم تک) اسی درمیان میں لکھے گئے ہوں گے۔ اس طرح مثنوی بیان الحقائق کے ساتوں حصے نو سال میں مکمل ہوئے۔ آخری حصے میں مصنف نے شرح الواصلین سے پہلے لکھی گئی کتابوں کی ایک لمبی فہرست زیر عنوان "اشارات باسامی کتب" دی ہے۔ ان میں سے صرف تین زمانہ کے دست برد سے بچ سکیں واضح ہے کہ یہ ۸۷۶ھ/۱۴۷۲ء سے پہلے لکھی گئی ہوں گی۔ تینوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محبوب الصدیقین[۱] (۲) مہر القلوب[۲] (۳) کشف الارواح[۳]۔

اس فہرست میں سے اگر ان کتابوں کے نام نکال دیے جائیں جن کے نام پہلے حصے مصباح الارواح (سالِ تصنیف ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء) میں درج ہیں تو باقی کتابوں کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے وہ بھی ۸۶۶ھ اور ۸۷۶ھ کے درمیان لکھی گئی ہوں گی چونکہ تین مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ کسی دوسری کتاب کا سراغ نہیں ملتا اس لیے یہ ممکن نہیں کہ بیان الحقائق کے بقیہ پانچ حصوں کا تعین کیا جا سکے البتہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نام شرح الواصلین میں درج تھے۔

---

[۱] مثنویات جالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) مخطوطہ جلد دوم ورق ۱۸۲ اب تا ۱۸۳ ب

(۱) نعت و منقبت (۲) مرآت (۳) گنج (۴) روح القدس (۱۸۳ ب ورق) (۵) تنبیہ (۶) محبوب

محبوب الصدیقین یہ ۱۰۸ صفحوں کی ایک مختصر مثنوی ہے لیکن بوہار لائبریری (جلد نمبر ۳۵۷) میں محفوظ پانچ مثنویوں میں سب سے طویل مثنوی یہی ہے بقیہ چار مثنویاں صرف ۲۷ صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ بیان الحقائق کا حصہ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ بیان الحقائق کے پہلے حصے مصباح الارواح سے دو سال پہلے ۸۶۶ھ میں مکمل ہو چکی تھی[۱]۔

ہفت صد و شصت و شش ز ہجرت اوست　　کہ مئے صاف او بجام سبو است

اس مثنوی کا انداز بیان بھی دوسری مثنویوں جیسا ہی ہے لیکن اس کی بحر بدلی ہوئی ہے۔ یہ مثنوی صدق اور سچائی کی تعلیم دیتی ہے[۲]، اس لیے اس کا نام محبوب الصدیقین رکھا گیا ہے، یہ خدا سے لو لگانے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔

بس کنم این حدیث پُر آشوب[۳]　　روئے آرم بجانب محبوب
این مقالت و ذکر آتشبار　　جمع کردم ز بہر راہ گذار
تا بخوانند و ذکر راہ کنند　　چشم دل سوئے روئے شاہ کنند
زاں دریں کتاب اے ستّار　　شرح زلف و خال آں دلدار
اندریں سفر ذکر بتاں نیست　　غیر اشراق حال مستاں نیست

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۰) (۷) کشف روح (۸) مصباح (۹) احکام (۱۰) نہایت (۱۱) ہدایت (۱۲) ہدایت (۱۳) فتح ابواب (۱۴) شرح الواصلین (۱۵) ترکیب و ترجیع (۱۶) مشکوٰۃ (۱۷) کلید باب فقر (۱۸) معلومات (۱۹) مہر افروز (۲۰) مستزاد (۲۱) قصائد (۱۸۳ ب ورق) (۲۲) غزل (ورق ۱۸۳ اب) (۲۳) میزان (۲۴) مہر القلوب [۲] مثنویات جالی مخطوطہ (بوہار) نمبر ۳۵۷ ورق ۳۸ ب تا ۱۰۲ الف [۳] ایضاً ورق ۱ ب تا ۱۰ الف [۴] بوڈلین لائبریری کیٹلاگ ورق ۸۷، ۴۸۸ تا

[۱] مثنویات جالی مخطوطہ بوہار نمبر ۳۵۷ ورق ۱۰۲ الف [۲] مثنویات جالی مخطوطہ بوہار نمبر ۳۵۷ ورق ۳۹ ب [۳] ایضاً ورق ۱۰۲ الف

جمالی

ہر کہ او مشتاق وجانباز است — طالب این کتاب واین راز است

مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب ذات لافانی[1] کے جاننے کا نظارہ کراتی ہے،

ایک[2] دوسری جگہ وہ کہتا ہے۔

گوش صدق آر بیش این کلمات — تا درین عرصہ می نگردی مات

ہم زبان مقطعات شوی — ناظر وجہ خوب ذات شوی

اس مثنوی میں مندرجہ[3] ذیل کتابوں کے نام ملتے ہیں (۱) مراۃ (۲) کنز (۳) شرح چہار (۴) تنبیہ (۵) میزان (۶) غزل (۷) مستزاد۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں مثنوی زیر بحث کی تکمیل (۸۶۶ھ / ۱۴۶۱-۶۲ء) سے پہلے مکمل ہو چکی ہوں گی۔

مہر القلوب| اس مثنوی کا[4] موضوع تصوف ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا لیکن قیاس ہے کہ یہ ۸۶۸ھ / ۱۴۶۳-۶۴ء سے قبل لکھی گئی ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر نہ تو محبوب الصدیقین[5] (تصنیف ۸۶۶ھ) میں ملتا ہے۔ نہ مصباح الارواح[6] (تصنیف ۸۶۸ھ) میں۔ لیکن اس کا نام شرح الواصلین[7] میں موجود ہے جو ۸۷۶ھ کی تصنیف ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۸۶۶ھ اور ۸۶۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہوگی۔

یہ مثنوی اسی بحر میں نظم کی گئی ہے جس میں بیان الحقائق کا پہلا اور ساتواں حصہ نظم ہے۔

---

[1] مثنویات جمالی ورق ۱۰۲ الف [2] ایضاً ورق ۳۹ الف [3] ایضاً ورق ۹۸ الف تا ۹۸ ب [4] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) جلد دوم ورق ۱۸۹ الف تا ۲۰۲ الف [5] بوہار ورق ۱ ب تا ۶ الف [6] مثنویات جمالی بوہار مخطوطہ نمبر ۳۵۷ ورق ۱۹۸ الف تا ۹۸ ب [7] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) جلد اول ورق ۱۷۴ تا ۱۷۵ [8] ایضاً ورق ۱۸۳ ب

بایدت[1] این شعشعۂ مہر القلوب — رو ببین اندر پئے علم غیوب

حسن دل جو شعشعۂ مہر القلوب — می درانددم بدم پردۂ غیوب

اے جمالی[2] شرح این مہر القلوب — رو نہاں کن خوش دراں پردہ غیوب

تا کہ معنی غالب آید در کلام — پیش چشم حرف بیناں والسلام

اس مثنوی کی قیاس شدہ تاریخ تصنیف، اس کی بحر، اس کا موضوع اور بیان الحقائق کے آخری حصہ میں اس کا ذکر، یہ قیاس کرنے کی بنیاد فراہم کر دیتے ہیں کہ یہ بیان الحقائق کے گم شدہ حصوں میں سے ایک ہو سکتا ہے پھر بھی کامل یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

کشف الارواح| بوڈلین لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۱۲۷۴ چار حصوں پر مشتمل ہے اس کا پہلا حصہ جمالی[3] کی کشف الارواح ہے یہ ۴۰۰ صفحات کی ایک ضخیم مثنوی ہے اس کی ابتدا ورق ۱ الف سے ہوتی ہے اور اختتام ورق ۱۸۱ الف پر۔

قیاس ہے کہ یہ ۸۶۶ھ اور ۸۶۸ھ کے درمیان مکمل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ محبوب الصدیقین[4] (تصنیف ۸۶۶ھ) میں اس کا ذکر نہیں لیکن مصباح الارواح (تصنیف ۸۶۸ھ)[5] میں اس کا نام موجود ہے، مصباح الارواح جیسی ضخیم کتاب کی تکمیل کے لیے اگر ایک سال کی مدت مخصوص کی جائے تو اس کتاب کی تاریخ تصنیف ۸۶۷ھ متعین کی جا سکتی ہے۔ کشف الارواح[6]

---

[1] مثنویات جمالی بوہار مخطوطہ ورق ۱ ب [2] ایضاً ورق ۲ الف [3] باقی تین حصے فضیلت العقل، نور علی نور، اور مناجات ہیں [4] مثنویات جمالی (بوہار) مخطوطہ ورق ۱۹۸ الف تا ۱۹۸ ب [5] مثنویات جمالی (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) ورق ۱۷۵ [6] بوڈلین مخطوطہ نمبر (۱۲۷۴) ورق ۱۷۶ الف بوڈلین لائبریری کیٹلاگ صفحہ ۸۴۷ یا ۸۴۸

میں مصنف نے لکھا ہے کہ وہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد مصباح الارواح نامی کتاب لکھے گا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بیان الحقائق کے گم شدہ حصوں میں سے ایک نہیں۔

اس کتاب کا موضوع بھی تصوف ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں کی آمیزش ہے۔ دوسری مثنویوں کی طرح اس میں بھی قرآن، حدیث اور بزرگوں کے اقوال کے حوالے ہیں۔ ان کا فارسی نثر میں ترجمہ اور تشریح ہے۔ اور آخر میں اشعار میں کہانیاں بیان کی گئی ہیں تاکہ قاری اچھی طرح مفہوم سمجھ لے۔ اس کی بحر ششم رکنی[۱] ہزج محذوف ہے جو محبوب الصدیقین اور بیان الحقائق کی بحر نہیں۔

اب ہم باقی چھوٹی چھوٹی مثنویوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں؛
فرصت نامہ[۲] نصرت نامہ[۳] قدرت نامہ[۴] فضیلت العقل[۵] نور علی نور[۶]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں کہن سالی میں بیان الحقائق کی تکمیل کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان کا ذکر محبوب الصدیقین، مصباح الارواح اور شرح الواصلین[۷] میں نہیں ملتا۔ ان کے عنوانات بھی یہی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ کہن سالی کی تصنیفات ہیں کہن سالی میں اسے فرصت ہی فرصت تھی، نصرت، قدرت اور فضیلت اسے حاصل تھی اور یہ سب مل کر "نور علی نور" بن گئیں۔

---

[۱] مثنویات جالی ورق ۱۱ الف بنا مت نامہ را سر بر کشایم بہ کہ اندر کوئے عشقت می سرایم
[۲] مثنویات جالی بوہار مخطوطہ نمبر ۳۵۷ ورق ۶ ب تا ۱۱ الف [۳] ایضاً ورق ۱۱ ب تا ۲۴ الف [۴] ایضاً ورق ۲۴ ب تا ۳۷ الف [۵] بوڈلین لائبریری مخطوطہ نمبر ۱۲۷ ورق ۱۸۱ ب تا ۲۰۳ ب [۶] ایضاً ورق ۲۰۴ الف تا ۲۱۳ الف [۷] مثنویات جالی بوہار مخطوطہ ورق ۹۸ الف تا ۹۸ ب مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد اول ورق ۴۷ ب تا ۷۵ ب جلد دوم ورق ۱۸۲ ب تا ۱۸۳ ب

ان مثنویوں سے چند شعر نمونتاً درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) بیا فرصت شمار این زندگانی — بچنگ آور حیات جاودانی

(فرصت نامہ ورق ۷ ب)

(۲) جالی بند کن این راز خوبان — بہار آمد روان شد سوئے بستان

(ایضاً ورق ۱۱ الف)

(۳) بہ تقویٰ اقتدا با مصطفیٰ کن — ببیں آں قامت و درود بر خدا کن
بہ پیش مرتضیٰ بے شک فنا شو — با این علم و عمل دایم بقا شو

(ایضاً ورق ۱۰ ب)

(۴) جالی در این حسن گرفتار شد — کہ خوش قامتے دید و بر دار شد

(نصرت نامہ ورق ۱۳ ب)

(۵) جالی معین محبت بدید — جانش بدید و بجانش رسید

(قدرت نامہ ورق ۲۷ الف)

(۶) یکے وصل می دید در اصل ذات — یکے فرع می دید اندر صفات

(ایضاً ورق ۴۳ الف)

(۷) مرتضیٰ ساقی و جالی جام — مرتضیٰ بادہ و جالی کام

(ایضاً ورق ۷۳ الف)

(۸) باخرد مند باش و چہ بر شی (؟) باش — مقصد کل نمودمت خوش باش

(نور علی نور ورق ۲۰۷ الف)

ان مثنویات میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں حوالے ان کی تشریح اور کہانیاں بھی ان میں پائی جاتی ہیں

نعتِ سنائیؒ

از

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

فارسی زبان کے صوفی اور نعت گو شعرا میں حکیم سنائیؒ کو مقام رفیع اور مرتبۂ عالی حاصل ہے، مشرب فقر میں مشائخ صوفیہ انہیں شیخ عالی قدر تسلیم کرتے ہیں، اسم گرامی مجدود بن آدم ہے، اور کنیت ابوالمجد ہے، سنائی تخلص فرماتے ہیں،

شعراء را بلفظ منظوم　　　زین قبل نام گشت مجدود (سنائی)

سنہ ولادت بہ تحقیق و تعیین مذکور نہیں لیکن مدرس رضوی نے تحقیق کے بعد ۴۷۳ھ کو قرین قیاس کہا ہے[1]، وطن غزنین تھا،

گرچہ مولد مرا بہ غزنین بود　　　نظم شعرم چو نقش ماچین بود

ابتدا میں شعر گوئی کو مدح امرا میں وسیلۂ معاش بنا لیا تھا[2] ایک دن ایک رندِ پاکباز کے اس طنز مخلصانہ پر کہ سنائی دروغ گو ہے، یعنی مداح امراء ہے، اگر قیامت میں سوال ہو کہ دربار میں کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا، اس مشغلہ سے توبہ کرکے گوشۂ قناعت اختیار کیا، بعد ازاں حلقۂ تصوف میں داخل ہو گئے[3]۔

من کیے شاعرو دخیل و غریب　　　راہ عزلت گزیدہ در عالم

یا تو یہ حال تھا کہ شب و روز تاجداروں کے درباروں میں مدح خوانی کرتے

---

[1] مقدمہ دیوان سنائی مرتبہ مدرس رضوی ص و　[2] ایضاً ص ہ

گزرتی تھی یا اب یہ حال ہوا کہ تاجداروں کی نذر تک قبول نہ کرتے اور اپنے ہاں ان کی حاضری کی درخواست یہ لکھ کر رد فرما دیتے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا"[1] دین و دیانت کا یہ درجہ تھا کہ

بعنایت ازلی راہ بسرچشمۂ ازلی بردہ و بطور دیگر خود گفتہ بندۂ دین و

چاکر ورع و پارسائی بودہ است[2]

برہنہ سر و پا عالم بے تابی و اضطراب شوق میں حج و زیارت مبارک سے مشرف ہوئے، غزنین واپس ہوئے تو جذب و مستی کا ایک عالم طاری تھا۔ حالِ دل ترک ماسوا پر مائل تھا، شیخ ابو یوسف ہمدانیؒ سے بیعت ارادت فرمائی۔ پھر صحبت شیخ نجم الدین کبریٰ سے بھی فیضیاب ہوئے، وفات کے وقت یہ شعر ورد زبان تھا،

باز گشتم زاں چہ گفتم زاں کہ نیست　　　در سخن معنی و در معنی سخن

پایان زندگی کے متعلق قرین صواب قول ۵۴۵ھ (۱۱۵۰ء) سے پہلے کا ہے، شاعر نے یہ تاریخ وصال کہی،

عقل تاریخ نقل او گفتا　　　طوطی اوج جنت والا[3]

حکیم سنائیؒ نے تقریباً ۳۵ ہزار اشعار کہے ہیں جو ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف میں مندرج ہیں:۔

(۱) دیوان قصائد و غزلیات۔ ایک بار یہ دیوان طہران میں اور پھر بمبئی میں طبع ہوا ہے، اس میں تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں[4]۔

---

[1] نفحات الانس جامی ص ۳۸۹　[2] مقدمہ دیوان سنائی از مدرس رضوی ص د ک ب۔

[3] مقدمہ دیوان حکیم سنائی از رضوی ص ب ز[4] مقدمہ سیر العباد الی المعاد از سعید نفیسی۔

(۲) مثنوی حدیقة الحقیقة و شریعة الطریقة: اس مثنوی میں بھی تقریباً گیارہ ہزار اشعار ہیں، ارباب نظر اس کو حکیم سنائیؒ کا شاہکار شمار کرتے ہیں جس کی تکمیل ایک سال کی مدت میں ہوئی

(۳) طریق التحقیق | کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں "طریق التحقیق حکیم سنائیؒ" کے نام سے فارسی تصوف میں ایک قلمی مثنوی ہے[1] اس کو محمد فخر الدین صاحب کاتب نے کسی نسخہ سے نقل کیا ہے، آخر کتاب میں یہ عبارت درج ہے:-

تمت هذه الرسالة الشريفة مسمى طريق التحقيق حكيم سنائى قدس الله سره العزيز

اس مثنوی میں چند مختلف صوفیانہ اور الٰہیاتی عنوانوں پر منظوم بحث و تلقین ہے لیکن اس میں کوئی عنوان نعت سے متعلق نہیں ہے

(۴) مثنوی سیر العباد الی المعاد | حکیم سنائیؒ نے حدیقہ ہی کی بحر میں یہ مثنوی لکھی ہے اس کے شائع ہونے کی عرصۂ دراز تک نوبت نہیں آئی تھی، جامعۂ طہران کے نامور ادیب پروفیسر سعید نفیسی کی تصحیح اور حسین کوہی کرمانی کے اہتمام سے چاپ خانہ آفتاب طہران میں شائع ہوئی ہے، مثنوی کی معنوی قدر و قیمت کے لحاظ سے حدیقہ کے بعد اس مثنوی کا مرتبہ مانا جاتا ہے

مثنوی سیر العباد الی المعاد کہ پس از حدیقه پرمغزترین و بہترین مثنویات ہست[2]

لیکن اس کتاب میں بھی کوئی نعتیہ کلام موجود نہیں،

(۵) حدیقہ میں نعت | عام طور پر شعرا مثنویات میں حمد کے بعد نعت کو آغاز سخن میں بطور تبرک جگہ دیتے ہیں، لیکن نعتیہ شاعری کے اس اولین ممتاز مخزن "حدیقہ سنائی"

[1] فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ نمبر ۴۰۳، تصوف فارسی [2] سیر العباد الی المعاد مقدمہ آقای سعید نفیسی صفویا دیب

میں موجود ہے۔ حال یہ نہیں ہے باب اول تقریباً سو مختلف نظموں پر مشتمل ہے تحمید، توحید، معرفت، فقر و توکل کے کئی پہلو ان پر ان نظموں میں دقیق مباحث درج ہیں یہ باب اول زیر نظر نسخہ کے ۱۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل باب کے آخر میں دو نظمیں ہیں ایک کا عنوان ہے "التمثیل فی خلقة آدم و عیسی بن مریم علیہما السلام"[1] دراصل یہاں سے کلام کا رخ نعت کی طرف رجوع ہوتا ہے اس نظم میں حقیقت آدم و فضیلت آدمیت پر چند بلیغ اشارات ہیں مثلاً

پدر آدم اندریں عالم
هست از آن دم که زاد مریم

تن که تن شد ز رنگ آدم شد
جان که جان شد ز بوی آن دم شد

هر که او آن دم است آدم اوست
وان که او نیست نقش عالم اوست[2]

اس کے بعد اس باب کی آخری نظم بعنوان "ذکر الانبیا خیر من حدیث الجہلاء" ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم کا ایک حصہ دراصل سید الانبیاءؐ کے ذکر و نعت کی ایک عام تمہید ہے کلام کا آغاز منصب انبیاء کے اس ذکر سے ہوتا ہے

انبیاء راستان دین بودند
عقل را راه راست بنمودند[3]

لیکن انبیاء علیہم السلام کے راستہ کو لوگ ترک کرنے لگے اور دین حق روپوش ہونے لگا، لوگ سرگشتۂ رسوم و قیود و مجاز ہو گئے،

دین حق روی خود نهان کرده
هر یکی دیو را عیان کرده

بدعت و شرک سر بر آورده
زندقه جمله سر بر آورده[4]

حتی کہ بعثت انبیاءؑ کے ظہور سے پہلے بحر و بر میں انسانیت کی تباہی و گمراہی

[1] حدیقہ باب اول نظم التمثیل فی خلقة آدم ص ۱۷۷۔۱۸۰، [2] حدیقہ باب اول ص ۱۷۹ [3] ایضاً ص ۱۸۰

کا یہ عالم ہوا ہے

ملکہ توران و مملکت ایران — شدہ از جور یکدگر ویران

حبشہ آشفتہ سوئے یثرب — فیل با ابرہہ ز مرغ حرب

خانہ کعبہ گشتہ بت خانہ — یگرفتہ بغصب بیگانہ

بر جہالت جہاں دیر نیرنگ — بر خردمند راہ دین شد تنگ[1]

عالم انسانیت کی اس تباہی و گمراہی کو دور کرنے کے لیے نور ہدایت محمدی طلوع ہوا، جیسا کہ پہلے بھی عہد بعہد انبیاءؑ مطالع انوار بن کر ظہور پذیر ہوتے رہے، ظلمات شرک انوار توحید ہی سے رفع ہوتے ہیں اور توحید کے حامل و علمبردار انبیاءؑ ہی ہوتے ہیں، اس لیے حکیم سنائی ثنائے حق کے بعد ثنائے انبیا سپرد قلم کرتے ہیں، خاصۃً نعت احمد مرسلؐ و رحمت عالمؐ

چوں بگفتی ثنائی حق اول — پس بگو نعت احمدؐ مرسل

چوں ز توحید گفتہ شد طرفے — گفت خواہم ز انبیاء شرفے

خاصۃً نعت رسول بازپسیں — آن ز پیغمبراں ہمیں و گزیں[2]

اس تمہید کے بعد باب ثانی یعنی "باب الثانی فی فضیلۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے نعتیہ نظموں کا سلسلہ شروع ہے، پہلی نظم بعنوان "فی فضیلۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلی سائر الانبیاء" ہے۔

ابتدا کے چند شعر آفتاب سعادت کی چند تجلیات کا تذکرہ ہیں کہ آفاق میں ایسا پامرد کوئی ظاہر نہیں ہوا کہ اس کے نور کی تعظیم کے لیے دونوں عالم

[1] حدیقہ باب اول ص ۱۸۰، [2] حدیقہ باب اول ص ۱۸۰ ذکر الانبیاء

سجدہ ریز ہو گئے ہوں،

آمد اندر جہاں جان ہر کس — جان جانہا محمد آمد و بس

چوں بجنید بر سپہر جلی — آفتاب سعادت ازلی

آن سپہرش چہ بارگاہ ازل — آفتابش کہ احمد مرسل[1]

سنائی نے اس کے بعد سارے انبیاء پر فضیلت کے چند پہلو اور وجوہ کمال بلاغت سے لکھے ہیں،

دیدہ جان پاک آدم ازو — معنی بکر[2] نغز محکم ازو

انبیا ریختہ ہم از زر او — ہر چہ شان نقد بود بر سر او

تا شب نیست صبح ہستی زاد — آفتاب چنیں ندارد یاد[3]

ذکر فضیلت کے اختتام پر "عالم جزو و نفس کل" کے ساتھ آپ کی نسبت کا بیان ہے،

عالم جزو را نظام بدو — غرض نفس کل تمام بدو

قدمش در ازل نفرسودہ — قدمش در ابد نیاسودہ

ہست کردہ ز نور و لطف گلش — شرق و غرب ازل درون دلش[4]

دوسری نظم کا عنوان ہے، "فی معراجہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ" اس نظم کا مطلع ہے،

بر نہادہ ز بہر تاج قدم — پائے بر فرق عالم و آدم[5]

[1] حدیقہ باب اول ص ۱۸۴ ذکر الانبیاء [2] معنی بکر نغز محکم کہ عبارت از آیات محکم است۔ ص ۱۸۳، ۱۸۵ [3] حدیقہ ص ۱۸۳ [4] حدیقہ ۱۸۵-۱۸۴ [5] ایضاً ۱۸۵-۱۸۴

اس کے بعد ذکر معراج شروع ہوتا ہے اور صرف سات آٹھ اشعار میں واقعات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ واقعات کے بیان نے اختصار کے باعث جامع اشارات کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔

گوفت سبحانش الذی اسریٰ	شدہ زانجا بہ مسجد اقصیٰ
در شب از مسجد حرام بکام	رفتہ و دیدہ و آمدہ بمقام
بنمودہ بدو عیاں مولیٰ	آیۃ الصغریٰ و آیۃ الکبریٰ[1]

معراج مبارک کے اس بیان میں بیانیہ مثنویات کا سا تسلسل ہے نہ تفصیل۔ صرف چند اشعار میں بلا ترتیب چند اہم واقعات کی طرف اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ فارسی شاعری کا پہلا معراج نامہ ہے۔ اولیت و معنویت کی وجہ سے اس کی اہمیت ہے۔ یہ معراج نامہ کی پہلی کڑی ہے۔ سنائی کے بعد بڑے نعت گو شعراء نے معراج نامہ کو ارتقاء کے مدارج کمال پر پہونچا دیا۔ خصوصاً نظامی کی نعتیہ شاعری میں معراج نامے نعتیہ شاعری کی معراج پر پہونچ گئے ہیں۔

واقعات معراج کے بعد کی گفتگو معراج کے چند معنوی پہلوؤں پر مرکوز ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے بعض شعراء واقعات معراج ہی کے سلسلہ میں معنوی نکات سمیٹ لیتے ہیں۔ اس کے بعد سات اشعار حقائق محمدی کے سات نکات کے ترجمان ہیں۔

شدہ اندر زمین بفضل و نظر	خاک آدم ز آفتابش زر

زادہ از یکہ گر بعلم و بدم	آدمؑ از احمدؐ احمدؐ از آدمؑ
غرض عالم آدمؑ از اول	غرض آدمؑ احمدؐ مرسل
از پئے او زمانہ را پیوند	بسر او خدائے را سوگند
در او بودہ جائے روح القدس	پائے او سجدہ جائے روح القدس
گر نہ از بہر عاد بودے	ذل خاک ایں کمال نمودے
خلق او مایہ روح حیواں را	خلق او داد بہ نفس انساں را[1]

تشبیہات ہیأت و فلکیات | ان نکات کے اختتام پر چند نعتیہ مضامین نے ہیأت و فلکیات سے ماخوذ تشبیہات کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔[2]

اس کے بعد نئی نظم کا عنوان پہلی نظم کا تتمہ ہے۔ البتہ بعنوان فی بدایۃ ذاتہ علیہ السلام ایک مستقل نظم ہے۔ اس نظم کے مباحث یہ ہیں۔

(۱) ظہور سے پہلے نور محمدی کا کیا مقام تھا اور کہاں (۲) فضل قدم نے اس رحمت الٰہی کو کیوں اور کس طرح رحمت عالم آب و گل دی (۳) اس ظہور رحمت کے کیا آثار پیدا ہوئے۔

اس کا جواب سنائی کی زبان پر یہ ہے۔

جان او بودہ در طریقت حق	گوہر حضرت حقیقت حق
رحمت آب و گل درین عالم	رحمتش نام کردہ فضل قدم
زانکہ بنمود حق بجان و دلش	رمزہائے حقیقت از دلش
طلبش زینت جہاں آمد	راحتش راحت روان آمدے[3]

اس کے بعد کی نظم میں سنائی رسولؐ کی یہ کرامت و امتیاز بیان کرتے ہیں کہ اگر پیش آدم ملک ابلیس ہو گیا تو آپؐ کا شیطان مسلمان و ملک ہو گیا، آپؐ نور بینندہ و دل جویندہ ہیں،

واسطہ میان خلق و حق | نی اتباعہ علیہ السلامؑ کے زیر عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ قرار دیا ہے،

معجزات | اس کے بعد معجزۂ شق القمر اور آتشکدہ کے سرد ہونے کا ذکر ہے۔

نطق رسول اور دیدۂ قبول | معجزات کے بعد سنائی کہتے ہیں کہ نطق رسولؐ نے جو کچھ عقول انسانی پر پیش کیا اُسے فطرت انسانی اور روح ایمانی نے دیدۂ قبول پر رکھا،

نطق او ہرچہ در عقول نہاد   روح بر دیدۂ قبول نہاد[1]

یہ نظم اس پر ختم ہوتی ہے کہ جو کچھ نعتیہ مضامین بیان ہوئے ہیں انکی شرح یا سرچشمہ الم نشرح ہے،

ہمہ خلق و وفاد بسط و فرح   شرح این نعتہا الم نشرح[2]

شرح صدر رسولؐ | بعد کی نظم کا عنوان اسی مناسبت سے فی انشراح صدرہ علیہ السلامؑ ہے،

سینۂ او کشادہ روح نخست   ہرچہ جز پاک دید پاک بشست[3]

عقل و رسالت | عقل کا تجربہ جوں جوں بڑھتا جائیگا یہ محسوس ہوتا جائیگا کہ نقل کو اشارہ رسول پر تپیدہ سر اور گوش بر آواز ہونا چاہیے نور رسالت کے بغیر "عقل" یار دیو نفسانی ہوتی ہے، اور انوار رسالت کے ساتھ فکر، عقل روحانی بن جاتی ہے،

نور کز خلق او مو قر شد   چشمۂ آفتاب وکو ثر شد
عقل داؤد وار در محراب   پیش او خرّ راکعاً و اناب
شرع او روح عقل روحانیست   ورنہ تو یار دیو نفسانیست

۱؎ حدیقہ ص ۱۹۶ ۲؎ حدیقہ ص ۱۹۹ ۳؎ حدیقہ ص ۲۰۲

وفیات

ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

گذشتہ ۱۲ر فروری کی رات کو ریڈیو میں خبر سنی کہ ڈاکٹر یوسف حسین اللہ کو پیارے ہوگئے یہ خبر سن کر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق بزرگ دائمی مفارقت دے گیا، رات بڑے کرب سے گذری، ان سے میرا پہلا تعارف ۱۹۳۴ء میں ہوا، میں کچھ دنوں جامعہ ملیہ میں بھی رہا، قرول باغ کے جس مکان میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے سکونت پذیر تھے، اسی کے پاس میں ایک مکان میں مقیم تھا، ان دنوں ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے استاد تھے، عید منانے اپنے محبوب بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس آگئے تھے، ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو سیاہ شیروانی میں ملبوس تھے، بہت ہی شکیل اور رعنا جوان نظر آئے، اسی زمانہ میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین مرحوم یعنی ان کے سب سے بڑے بھائی کے لڑکے جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور مزید تعلیم کے لئے یورپ جانے کی فکر میں تھے، وہ خالی اوقات میں میرے پاس آجاتے، ان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے گھر کی عورتیں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو خوش قسمت اور مالدار سمجھتی ہیں، کیونکہ ان کے یہاں اچھے سوفہ سٹ اور دوسرے

فرنیچر بس جو اس زمانہ میں ہی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں نہ تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ گیا اور ان کی وجاہت سے مرعوب ہو کر گھر واپس آیا۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر یوسف حسین نے گارساں دتاسی کے خطبات کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ کیا تھا جو رسالہ اردو حیدرآباد دکن میں شائع ہو رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر عبدالحق کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ اس میں کسی کی تحریر کا شائع ہونا اس کی علمی قابلیت کی بڑی سند تھی۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کر کے فرانس گئے اور پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے فرانسیسی زبان بڑی محنت سے سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی۔ ہندوستان آکر ڈاکٹر عبدالحق کی فرمائش پر انھوں نے خطبات گارساں دتاسی کا ترجمہ شروع کیا تو اس کے پندرہ خطبات کے ترجمے کیے۔ جب یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحق ان کے بہت شکر گزار ہوئے۔ اس وقت وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ریڈر ہو چکے تھے۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

مجھ کو دارالمصنفین آئے ہوئے کچھ دن ہوئے تھے کہ ان کی انگریزی کتاب نظام الملک جاہ معارف میں ریویو کے لیے ۱۹۳۶ء میں آئی۔ اس کو بہت شوق سے پڑھا اور انگریزی زبان میں ان کی تحریری قدرت کا قائل ہوا۔ اس کتاب میں انھوں نے نظام الملک آصف جاہ کی سیرت نگاری جس طرح کی ہے وہ نظام حیدرآباد کے خاندان سے ان کی محبت کا ثبوت ہے۔ حیدرآباد میں ان کی زندگی کے بہت اچھے دن گذرے اور ان کی یادوں کی قندیلیں برابر روشن کرتے رہے۔

نظام الملک دوسرے مذاہب کے لیے بڑے روادار تھے لیکن اپنے اسلامی عقائد میں بھی پختہ تھے۔ ان کی یہ پختگی بچپن ہی سے تھی۔ وہ زحمت گوارا کر کے تمام مذہبی مراسم اور عقائد کو بڑے اہتمام سے بروئے کار لاتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن اور سنت کے احکام کی پابندی کرتے، لیکن وہ عالی قسم کے متعصب مسلمان نہ تھے۔ وہ دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے، غیر مسلموں کو اہم اور اعلیٰ عہدوں پر مامور کرتے۔ یہی روش ان کے جانشینوں نے اختیار کی۔ ان کے مزاج کی بے نیازی، اچھائیوں اور انسانیت نوازی کی وہ تمام لوگ قدر کرتے جن کا واسطہ ان سے پڑتا۔ وہ ان کی مدح کرنے کے ساتھ ان سے محبت کرتے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان کے اور دوسرے حکمرانوں اور قائدوں کی سیرت کی سطح بہت ہی نیچی ہو گئی تھی تو اس برے زمانہ میں نظام الملک کا اچھا کردار نمایاں ہو کر ابھرا (ص ۲۰۴)

ان کی اہم تصنیف روح اقبال ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تو اس سے ہندو پاک کے تمام ارباب ذوق ان کی ادبی بالغ نظری سے متاثر ہوئے۔ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری مرحوم نے اس کی اشاعت پر لکھا کہ اس سے بہتر کتاب تو پاکستان میں بھی نہیں لکھی گئی۔ ان کو اقبال سے عشق تھا، اسی لیے اس کے لکھنے میں ان کے ہر صفحہ پر سرشارانہ کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ شروع میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین شاید یہ کہہ اٹھے ہوں گے کہ اس کی ہر سطر پر ایک کرشمۂ حسن ہے جس کی طرف دامن دل کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ انھوں نے اس کی ابتدا ہی ایسے انداز میں کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت ان پر اقبال کی محبت اور عقیدت کا نشہ چھایا ہوا ہے۔

"اقبال کی طبیعت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی اور اس کی شخصیت میں ایسے مختلف عناصر جمع ہوگئے تھے جو عام طور پر کسی ایک شخص کی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس کے ذہن اور اس کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی۔ اس کے جمال پرست اور عشق پرور دل نے اپنے تخیل کی گل کاریوں سے اپنی ایک الگ دنیا آباد کر لی تھی۔ اس دنیا کی خیالی تصویر میں اس نے اپنے جذبات کے موئے قلم سے ایسی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کیا کہ انسانی نظر جب اس تصویر پر پڑتی ہے تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے۔ اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفان جو، صداقت پسند اور نظم آفریں روح تھی جو جذبۂ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ شاعر بھی تھا اور حکیم نکتہ داں بھی۔ اس کے ہاں درد و سوز بھی ہے اور رندی و مستی بھی، نصیحتیں بھی ہیں اور دین و تمدن کی تعلیم بھی، عقل و عشق کی ابدی کش مکش کا بیان بھی ہے اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی نقاشی بھی۔"

یہ اور نقادوں کی طرح محض عبارت آرائی نہیں، یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اقبال کے آرٹ، شاعرانہ مسلک، تخیلی پیکر، محاکات، خودی، مقاصد آفرینی، انسانی فضیلت، تاریخی استقراء، انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد، جماعت، مملکت، تمدن، نظام معیشت، تقدیر، جبر و اختیار، عشق اور موت کے تخیلات کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا ہے، اور جس انداز میں انھوں نے اقبال کے ان تفکرات کو سمجھ کر سمجھایا وہ اقبال شناسی میں عرصۂ دراز تک مدد دیتا رہیگا۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ لکھا جائیگا، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اقبال کو پہلی دفعہ جس طرح سمجھانے

کی کوشش کی، اسی کی آوازِ بازگشت بعد میں سنائی دی۔ غالب کو سمجھانے میں اولیت کا جو درجہ حالی کی یادگارِ غالب کو ہے، وہی اقبال کو سمجھانے میں روحِ اقبال کا ہے۔

روحِ اقبال کے بعد ان کی مشہور کتاب اردو غزل منظرِ عام پر ۱۹۵۵ء میں آئی تو اس سے لوگ اردو شعر و شاعری میں ان کی گہری بصیرت سے متاثر ہوئے اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کے حلقہ میں اردو غزل کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی۔ انھوں نے اردو غزل گو چار سو صفحے سے زیادہ میں سمجھایا ہے، اور جس دیدہ وری اور عرق ریزی سے اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ان نقادوں کے لیے ایک درس ہے جو چھوٹے چھوٹے مقالات لکھ کر اردو کے نقادوں کی صف اول میں جگہ پانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ وہ غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

> شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ اس کو مٹانے والا۔ غزل گو شاعر جب زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت گری کریگا۔ وہ حسن آفرینی بھی کریگا اور قدر آفرینی بھی لیکن یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا جنکا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی چاہیئے جس میں اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں پنہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر

نہیں پیدا ہو سکتی، اور یہی دونوں اجزاء غزل کی جان ہیں، انہیں سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے (اردو غزل (ص ۳۰۰ ۔ ۴۴ و ۴۴)

ڈاکٹر صاحب غزل کو سمجھنے کے لیے گویا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں اور جب ان کی ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں یہ تحریر قلمبند ہوئی ہے اسی کی شان پوری "اردو غزل" میں جلوہ گر ہے، جس کا انتخاب ہر دانہ انداز ارباب ذوق کے ادبی کام و دہن کے لطف و لذت کا باعث بنا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب حسرت موہانی کی غزل گوئی سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب ان ہی کے نام سے معنون کی، ان کی ایک مستقل کتاب "حسرت کی شاعری" کے نام سے بھی شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنا خراج عقیدت ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے، حسرت کی غزلوں کے استفہامی اشعار اور پیچ و خم کے استعمال سے وہ اپنے کلام میں جو تاثیر اور حسن پیدا کرتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر پسند تھا۔

وہ اردو میں لکھنے کے ساتھ انگریزی میں بھی برابر کچھ لکھتے رہتے ہیں، اسلامک کلچر حیدرآباد میں ان کے جو مضامین نکلے وہ ۱۹۵۷ء میں کتاب کی صورت میں Glimpses of Medieval Indian culture کے نام سے شائع ہوئی جس کے اندر علیحدہ علیحدہ ابواب میں یہ عنوانات ہیں، اسلام اور بھکتی کا عقیدہ، ہندوستان میں تصوف، تعلیمی نظام، اردو زبان کا ارتقاء معاشرتی اور اقتصادی حالات، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں ان موضوعات سے جن کو بھی دلچسپی ہے وہ ان کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

وہ جامعہ عثمانیہ سے پنشن پا کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس کے پرو وائس چانسلر

سات سال تک رہے تو ان سے علی گڑھ میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، میری کچھ تصنیف بھی اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں، میں ان سے ملنے جاتا تو میری تصانیف کو اپنی الماری میں دکھاتے، اور اس وقت گھر میں جو میٹھی چیز ہوتی اس سے تواضع کرتے، ان کو رساول بہت مرغوب تھی، گھر میں موجود ہوتی تو اصرار کر کے کھلاتے۔

وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی نامزد ہوئے تو ان سے تعلقات اور بھی قریب تر ہو گئے، ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ وہ بھی دارالمصنفین تشریف لائے، اسی کے بعد انھوں نے اپنی کتاب یادوں کی دنیا لکھی تھی جو مجھ کو اور جناب شاہ معین الدین کو اس قدر پسند آئی کہ دارالمصنفین کے سلسلۂ کتب میں تو نہیں لیکن اس کی طباعت معارف میں کرا دی، ان کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی، یہ گویا ان کی خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں ان کے بیتے ہوئے زمانے کی یادیں ہیں، ان کی قوت ارادی نے ان کے حافظہ کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو یہ سب کے سب لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوئے جس میں جذبہ کی رنگ آمیزی اور خیالی پیکروں کی تحسین کے ساتھ ان کے آباء و اجداد، خاندان، بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ، دیار فرنگ، دیار تلنگ، علی گڑھ اور بہت سی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا بہت ہی دلچسپ مرقع ہے، وہ سات سال تک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے، اسلیے یونیورسٹی کیلئے دل میں بڑا درد اور نرم گوشہ رکھتے تھے، اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے رہنے اور نہ رہنے کے مسئلہ پر بڑی دلسوزی سے لکھتے ہیں۔

"جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم سے ناآشنا ہیں یا جن کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ اسے قومی وحدت کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں، اسلامی کردار

سے مراد یہ ہے کہ مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، قومیت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ بیدار ہو، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، مسلمانوں کی نمایاں اکثریت رہے، حکومت کے نامزد ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کیے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب اور روایات سے واقف ہوں اور یونیورسٹی کے سچے ہمدرد ہوں، یہ باتیں نہ رجعت پسندی ہیں اور نہ فرقہ واریت اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف بلکہ اقلیتوں کا تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو حکومت سلب نہیں کر سکتی، سوائے ایسی صورت کے کہ وہ نا انصافی پر اتر آئے" (ص ۵۹-۶۰)

ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے، اور وہ مسلم یونیورسٹی کیا مسلمانوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت کے ترجمان اپنی ادبی تحریروں میں بھی بنے رہے، میں پاکستان گیا ہوا تھا تو اس کتاب کا ذکر خیر وہاں کے علمی حلقہ میں برابر آیا، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو غزل کا حق طباعت دارالمصنفین کو دیا جو یہاں سے شائع ہو کر فروخت ہو رہی ہے،

ڈاکٹر یوسف صاحب کو اقبال کے ساتھ غالب سے بھی عشق تھا، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ وہ یورپ تعلیم کے لیے گئے تو اپنے ساتھ صرف تین کتابیں لے گئے، کلام مجید، کلام اقبال کا مجموعہ اور دیوان غالب، اسی لیے انھوں نے ۱۹۶۸ء میں غالب اور آہنگ غالب لکھی، اردو غزل میں غالب پر جو باتیں اختصار سے لکھی تھیں، اسی کو پھیلا کر اس کتاب میں لکھیں جو ۴۰۰ صفحے پر مشتمل ہے، غالب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر میں نے اپنی کتاب غالب مدح و قدح کی روشنی میں بڑا لمبا تبصرہ کیا

ہے اور خوش تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے مگر افسوس یہ کتاب اب شائع ہوئی جب ان کی رحلت ہو چکی ہے، یہ حصہ ان کی نظر سے نہیں گذرا تو کتاب کی طباعت سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی، اس موقع پر جتنے مقالات لکھے اور پڑھے گئے وہ ان ہی کی نگرانی میں بین الاقوامی غالب سیمینار کے نام سے شائع ہوئے۔ اس اثنا میں جب دہلی جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور وہ اپنے یہاں کھانا کھلائے بغیر رخصت نہ ہونے دیتے،

۱۹۷۶ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن حکومت ہند کی طرف سے منایا گیا تو اس میں مجھ کو بھی شرکت کی دعوت تھی، اس کے مختلف اجلاس میں ڈاکٹر صاحب خاص طور پر مجھ کو بلا کر اپنے پاس بٹھاتے، جناب علی یاور جنگ گورنر بمبئی کی نگرانی میں اس جشن کی ساری کارروائیاں انجام پا رہی تھیں، اس موقع پر امیر خسرو سے متعلق بہت کچھ ناروا باتیں کہی جا رہی تھیں، مجھ کو خسرو سے عشق ہے، ہر ناروا بات کا جواب دیتا رہا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری بڑی ہمت افزائی کی جب امیر خسرو سے متعلق کوئی ناخوشگوار بات کہی جاتی تو وہ مجھ سے چپکے سے کہتے "اٹھو اور جواب دو" میرا جواب سن کر میری پیٹھ پر تھپکی دیتے،

اسی موقع پر راشٹرپتی بھون میں حکومت ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا، ڈاکٹر صاحب اصرار کر کے مجھ کو اپنے ساتھ وہاں لے گئے، ان دنوں دارالمصنفین کا کچھ مسئلہ ایسا تھا جس کے متعلق ایک مسلمان وزیر حکومت ہند سے گفتگو کرنے والا تھا، مگر ڈاکٹر صاحب رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کی حیثیت سے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان سے گفتگو

گی جائے، اتفاق سے وزیر صاحب بھی ایٹ ہوم میں تشریف لائے، تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کیا حرج ہے اگر ان سے اس مسئلہ پر رسمی گفتگو ہی کر لی جائے، یہ سنا تو میرا ہاتھ پکڑ کر بولے "نہ جاؤ، ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہونچ جائے گا" پھر ان کے پاس جانے سے روک لیا۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب "حافظ اور اقبال" شائع ہوئی، جس کے نام ہی سے ارباب ذوق چونکے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی اسرار خودی کا پہلا اڈیشن نکلا تو اس میں حافظ شیرازی کے متعلق لکھا تھا،

ہوشیار از حافظ صہبا گسار	جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است و نوا آموخت است	عشوہ و ناز و ادا آموخت است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش	چوں مریدان حسن دارد حشیش
بے نیاز از محفل حافظ گذر	الحذر از گوسفنداں الحذر

اسرار خودی شائع ہوئی تو حافظ سے متعلق اشعار کی بڑی مخالفت ہوئی، جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن میں ان اشعار کو نکال دیا، عام طور سے یہی خیال ہے کہ اقبال حافظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنی یہ کتاب لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حافظ پر کڑی تنقید کرنے کے باوجود اقبال اس کے حسن ادا اور لطافت بیان کا قائل تھا اور شعوری طور پر کوشش کرتا تھا کہ اپنی فارسی غزلوں میں اس کا رنگ و آہنگ پیدا کرے اور اس کے رموز و علائم کو برتے، اس نے حافظ کے استعاروں اور کنایوں کو اپنے فکر و فن میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے سمونے کی

پوری کوشش کی اور میرا خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا، (ص ۱۳-۱۱)

دونوں کے کچھ اختلافات بھی دکھائے ہیں، مثلاً حافظ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف اقبال کی اجتماعی مقصدیت کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کو مجبور نہ مانے، حافظ کے اشعار میں خودی کا مروجہ تصور کارفرما ہے، اقبال اپنے تصور میں منفرد ہیں، اسی قسم کے اور اختلافات دکھا کر ڈاکٹر صاحب آخر میں لکھتے ہیں کہ میں پھر اپنے اس خیال کو دہراتا ہوں کہ فارسی زبان کا کوئی شاعر طرز و اسلوب اور پیرایۂ بیان میں حافظ سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ اقبال ہے، اس کے ماسوا دوسرا کوئی شاعر حافظ کا تتبع نہ کر سکا، اقبال کو اس ضمن میں اولیت کا شرف حاصل ہے، میں اسے حافظ کے روحانی فیض اور خود اس کو اپنی ریاضت کا ثمرہ خیال کرتا ہوں، (ص ۱۴۳)

یہ دعویٰ ایسا ہے جو متفق علیہ نہیں کہا جا سکتا، روح اقبال میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا اس سے کسی کو اختلاف نہیں رہا، لیکن اس کتاب میں بہت سی مختلف فیہ باتیں آگئی ہیں، جن کی توضیح آئندہ ہی کی بحث و تمحیص سے ہو سکے گی، لیکن افسوس اس بحث میں خود ڈاکٹر صاحب کا کوئی حصہ نہ ہوگا، مگر وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ گئے ہیں، ہمارے نقاد اور ادیب اس کو پڑھتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے رہیں گے،

۱۹۷۷ء میں اقبال کا جشن منایا گیا، تو دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں میری بھی شرکت ہوئی، ڈاکٹر صاحب کو اس جشن کا اصلی روح رواں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس جشن کے منتظمین سے کچھ شاکی نظر آئے، اسی موقع پر غالب اکیڈمی میں ان

کے دو لکچر ہوئے ایک کا عنوان تھا "غالب اور اقبال" اور دوسرے کا عنوان تھا "حافظ اور اقبال"۔ ایک کی صدارت جرمنی کی مشہور مستشرق خاتون اینی شمیل نے کی جب ڈاکٹر صاحب کا لکچر ختم ہوا تو اینی شمیل نے بہت پر زور تقریر میں ان کے لکچر کی تعریف کی۔ اتفاق سے اس کے بعد وگیان بھون میں ایک ہی میز پر مجھ کو اینی شمیل کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ بولیں کہ ڈاکٹر صاحب کچھ اس لب و لہجہ میں اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے کہ وہ ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکیں، ان کی یہ گفتگو سن کر مجھ کو ہنسی آگئی، ڈاکٹر صاحب سے یہ گفتگو دہرائی تو وہ بھی ہنسکر کہنے لگے کہ ان لوگوں میں ایسے ہی تصنع ہوا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ "حافظ اور اقبال" جناب آنند نرائن ملا کی صدارت میں پڑھا تھا جب ان کا مقالہ ختم ہوا تو آنند نرائن ملا صاحب نے اپنے مختصر تبصرہ میں کہا کہ "حافظ اور اقبال میں کوئی مماثلت نہیں" اس مختصر رائے سے حاضرین پر سناٹا چھاگیا، ڈاکٹر صاحب بھی یہ سن کر خاموش رہے، یہ موضوع کچھ ایسا ہی متنازعہ فیہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پاکستان کے ناشر چھاپ کر فائدے اٹھا رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اقبال اکیڈمی لاہور اس کا حق طباعت ان سے خرید لے، ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اقبال کے جشن میں دہلی آئے ہوئے تھے، میں نے ان سے گفتگو کی، انھوں نے وعدہ کیا کہ روح اقبال اور حافظ و اقبال کو اپنی کمیٹی کے سامنے پیش کر کے ان کے حق طباعت کا معاوضہ ڈاکٹر صاحب کو دلا دیں گے، مگر یہ اب تک انجام نہیں پا سکا ہے۔

اپریل ۱۹۷۵ء میں انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامیہ میں میری دوبارہ

رکنیت کا انتخاب تھا، تو ڈاکٹر صاحب نے محض اپنی محبت میں مجھ کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دلائے، ان کی اس محبت کی قدر میرے دل میں برابر باقی رہے گی، مئی ۱۹۷۵ء میں اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ دہلی میں تھا، وہاں پہونچے تو وہ اپنی وضعداری میں اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، انھوں نے اپنے گھر کے ایک وسیع کرہ میں اپنے ذوق کی بہت سی کتابیں کئی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں، میں نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھ کو ان میں سے کئی کتابیں پسند آئیں جن میں مصر کا ایک بہت ہی خوش خط مطبوعہ کلام پاک تھا، ایک لمبی تقطیع کا بھی کلام پاک تھا جو ایران میں بہت ہی عمدہ کتابت کے ساتھ طبع ہوا، اس کو میں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم بولے کہ شہنشاہ ایران نے اس کے کچھ نسخے ہندوستان بھیجے تھے، ان میں سے ایک ان کو بھی نذر کیا گیا تھا، تاریخ و ادب کی کچھ اور کتابیں تھیں جو مجھ کو پسند آئیں، میں نے ان سے عرض کیا کہ ان میں سے آپ کچھ دارالمصنفین کو فروخت کر دیں، فوراً بولے جو کتابیں پسند آئیں لے جائیے میری طرف سے دارالمصنفین کو نذر ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ قیمت نہ لیں گے تو میں ان کو دارالمصنفین کے لیے لے جانا پسند نہ کرونگا، پھر اصرار سے کلام پاک کے یہ دونوں نسخے اور کچھ کتابیں میرے ساتھ کر دیں، کلام پاک کے یہ دونوں نسخے یہاں کے کتب خانے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں، میں نے یہاں سے بھی خط لکھ کر ان کی قیمت قبول کرنے کے لیے عرض کیا، مگر انھوں نے لکھا کہ اس اصرار سے ان کو تکلیف ہو رہی ہے، یہ بھی مجھ کو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں انھوں نے جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کو دیدی تھیں، انھوں نے ان کتابوں کے ساتھ اپنی دو انگریزی تصانیف –

اور (Two studies in early mughal history) بھی دیں اول الذکر کتاب
میں زیادہ تر سر سید احمد کے انگریزی، فارسی اور اردو میں خطوط ہیں، ان ہی کے
ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو انگریزوں یا اور دوسرے معاصروں نے انکو لکھے، علی گڈھ مسلم
یونیورسٹی کی تاریخ لکھنے میں اس کتاب سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے، یہ ۱۹۶۲ء میں ایشیا
پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی، دوسری کتاب ظہیر الدین محمد بابر پر ہے وہ لکھتے ہیں، بابر
ہندوستان کے عہد وسطی کا بہت ہی دل آویز اور رعنا حکمراں گذرا ہے، ڈاکٹر صاحب
مرحوم کے قلم سے اس کی شخصیت اور بھی زیادہ نکھر گئی ہے،

اسی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے غالب کی منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی
میں کیا ہے۔ جو چھپ رہا ہے، اس کے کچھ پروف بھی دکھائے اور کہا کہ بعض انگریزوں
نے اس ترجمہ کو بہت پسند کیا ہے، خدا کرے ان کا یہ ترجمہ مقبول ہو، ان کی
ایک کتاب "کاروان فکر" کے نام سے بھی شائع ہوئی، جس میں اخلاقی قدریں، علم اور
زندگی، تاریخ میں جبر و اختیار کی چھاؤں اور ادبی قدریں کے عنوانات ہیں، میرا
خیال ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور اس حصہ کے شب و روز کے
زیادہ تر لمحات صرف لکھنے پڑھنے میں گذارے، نظام الدین ویسٹ کے مکان میں
ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے رہنے کے لئے انتخاب کر رکھا تھا، اسی میں علم و ادب کے سارے
جلوے ان کی نظروں کے سامنے سمٹ کر آتے رہے، جن کو وہ اپنے قلم کی رعنائی سے کاغذ
کے صفحات پر منتقل کرتے رہے، وہ کچھ دنوں شملہ میں انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ
اسٹڈی میں رہے، پھر دہلی چلے آئے یہیں آخر وقت تک رہے، یہاں رہ کر علم و ادب
کا مینا کار جام پی کر سرشار اور مخمور رہے،

ان کی اردو غزل اور یادوں کی دنیا دار المصنفین کے دار الاشاعت کی
بکتی رہی ہیں گذشتہ جنوری میں ان کی رائلٹی کی رقم بھیجی جس کے شکریہ کا خط آیا، یہی
ان کا آخری خط میرے نام تھا، یہاں سے ان کی کتابوں کی رائلٹی بھیجی جاتی تو اس کو
وصول کرتے وقت ایسا محسوس کرتے کہ گویا دار المصنفین کی طرف سے ان کو رقم
مل رہی ہے، اس کو وہ اپنا کوئی حق نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی شرافت اخلاق تھی، ان کی
وضعداری، ان کے رکھ رکھاؤ کا طریقہ، ان کا استغنا، اور شہرت سے بے نیازی
کچھ ایسی تھی کہ اس کی مثالیں بہت کم لوگوں میں ملیں گی، دہلی میں رہتے تھے، ہر قسم کے
خاندانی ذرائع تھے، چاہتے تو اپنے لیے حکومت ہی سے بہت کچھ حاصل کر لیتے، خصوصاً
جب وہاں اس کی دوڑ لگی ہوئی ہے، کچھ ایسے مصنف بھی ہیں، جو ایک کتاب لکھتے ہیں، اس
کی رسم اجرا یا رونمائی کراتے ہیں، اور ہر قسم کے فوائد اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے
ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کے وقار کو کسی موقع پر جھکنے نہیں دیا، وقار خود
ان کے سامنے آکر جھکا، ان کو پانچ ہزار کا ایوارڈ بھی ملا، مگر ان کے بیش بہا علم کی
قیمت لگائی نہیں جا سکتی، ان کو پدم وبھوشن کا اعزاز بھی ملا مگر خود اس اعزاز
کو ان سے عزت حاصل ہوئی۔

ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقہ میں بڑا ماتم ہوگا، آج کل خاص خاص
حلقے ایسے بن ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کے بجائے، صرف ایک
دو سال رو کر اپنے چمن کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے، ایسے حلقہ کی نرگس اپنی بے
نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین کی دیدہ وری کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکی،
اس لیے ان کا یہاں ماتم نہ ہوا، تو تعجب کرنے کی بات نہیں، مگر جو اپنی نظروں میں

نور رکھتے ہیں، وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علم کی بصارت، بصیرت، ان کی درایت کی رعایت، پھر ان کے ادبی ذوق کی پاکیزگی، قلم کی رعنائی، تنقید نگاری کی دل آویزی اور گہرائی کو یاد کریں گے، اور اکثر یاد کر کے اپنے ذوق ادب اور علم تحقیق میں نفاست، نظافت اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے،

ڈاکٹر صاحب اب آپ وہاں ہیں جہاں اسلامی درد، مذہبی اضطراب اور ملی غیرت وحمیت کی بڑی قدر ہوتی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان محاسن کا بہت بڑا حصہ عطا کیا تھا، اس لیے شفیع المذنبینؐ کے صدقے میں آپ رب العالمین کی رحمتوں اور برکتوں سے ضرور سرفراز کیے جائیں گے، آمین ثم آمین۔

یادوں کی دنیا

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی بچپن سے لے کر ان کی ۷۶ برس عمر تک کی آپ بیتی یہ آٹھ ابواب پر منقسم ہے آخر میں اس کا بہت ہی مفصل انڈکس یا اشاریہ ہے، پہلا باب محمد شاہی دور میں شمالی ہند کی حالت اور کمپنی کے قرب وجوار میں افغانوں کی آباد کاری پر، دوسرا باب آباء واجداد پر، تیسرا ان کے سات لائق بھائیوں پر، چوتھا فخر خاندان جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سابق صدر جمہوریہ ہند کے سوانح وحالات اور ان کے علمی وادبی وتعلیمی وسیاسی کارناموں پر، پانچواں جامعہ ملیہ اسلامیہ پر، جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی چھٹا باب دیار فرنگ پر ہے، جس میں خصوصیت کے ساتھ فرانس کے تاثرات ومشاہدات زیادہ تفصیل کے ساتھ ہیں، ساتواں باب قیام حیدرآباد پر ہے جسکو دیار تلنگ سے تعبیر کیا ہے، آٹھواں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ پر ہے جسکے وہ کئی برس پرووائس چانسلر رہے اور وہاں بڑی خدمات انجام دیں، یہ آپ بیتی بڑی ہی ادیبانہ اور رندانہ پیرایہ میں ہے، اور ہر صاحب ذوق کے لیے قابل مطالعہ، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ قیمت: ۲۰ روپے

باب التقریظ والانتقاد

فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

از
مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئو

مجھے مخطوطات سے بہت شغف ہے، ایک دن اتفاق سے دار المصنفین جانا ہوا تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی فہرست مخطوطات عربیہ پر کتب خانہ میں نظر پڑ گئی، میں نے اس کو بہت شوق سے پڑھا، میں صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی مہربانی سے یہ موقع نصیب ہوا، میں نے فہرست پڑھی تو میرا جی چاہا کہ اس پر تبصرہ کی خدمت میں ہی انجام دوں، تاکہ جس مقصد کے لیے فہرست کے مرتب قاضی عبد النبی کوکب صاحب نے دار المصنفین کو یہ پیشکش کی ہے وہ پورا ہو جائے،

قاضی صاحب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے اور وہ اس کے لیے مستحق مبارکباد ہیں، انھوں نے فہرست نگاری کا حق ادا کر دیا ہے، اہل علم کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ اس کام میں ان کا تعاون بھی کریں۔

سرسری مطالعہ کے بعد کوکب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اس وقت جو باتیں ذہن میں آئی ہیں، ان کو عرض کرتا ہوں،

کوکب صاحب نے ص۱۲ پر عنوان فہارس القرآن کے تحت دو قلمی کتابوں کا

تعارف کرایا ہے اور دونوں کا تعارف کراتے ہوئے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ ان تالیفات سے جرمن مستشرق فلوگل کا تقدم قرآن کے اشاریہ ساز کی حیثیت سے ثابت نہیں رہتا

مگر ان کا یہ فرمانا کہ "قرآن کی اشاریہ سازی کی طرف توجہ کا سراغ واضح طور پر گیارہویں صدی ہجری میں پہونچتا ہے" تو اس کو لکھنے سے بیشتر کوکب صاحب کو سراغ رسانی کے لیے کچھ اور تگ و دو کرنے کی ضرورت تھی؛

قدیم مطبوعہ کتابوں میں ہماری نظر سے ایک اور ہندوستانی عالم مصطفیٰ بن سعید کی قابل قدر کتاب گذری ہے، جس کا نام "نجوم الفرقان لتخریج آیات القرآن" ہے، کتاب کی زبان فارسی ہے، اور مصنف اورنگ زیب عالمگیر کے لڑکے سلطان محمد اعظم شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھا، سال تصنیف ۳۷ سنہ جلوس عالمگیر ہے، سنہ ہجری کی نشاندہی علامات نجوم الفرقان سے ہوتی ہے، جس سے ۱۱۰۳ھ نکلتے ہیں،

مصنف نے الفاظ قرآن کو ان کی موجودہ شکل کے ساتھ حروف ہجی کی ترتیب پر مرتب کر کے جس پارہ کے جس رکوع میں وہ لفظ پایا جاتا ہے اس کی نشاندہی اس طرح کی ہے کہ لفظ پاک زیر و زبر کے ساتھ لکھ کر پارے کا عدد ہندسوں میں اور رکوع کا عدد حرفوں میں حروف ابجد کے حساب سے بتایا ہے، مثلاً "آباَئُهمَ ۲۲ د" یعنی یہ لفظ بائیسویں پارے کے چوتھے رکوع میں ہے، یا مثلاً "اُخطَنا ۱۶ ب" یعنی یہ لفظ سولہویں پارے کے دوسرے رکوع میں ہے، کتاب مطبع محمدی لکھنؤ میں مجتہد شیعہ سید حسین کے حکم سے چھپی ہے؛

اس کتاب کا مؤلف لکھتا ہے؛-

ہر چند تالیفے چند از سلف نیز بنظر در آمدہ بود لیکن ہیچکدام از انہا باوجود کثرت حجم کہ بدہ دوازدہ ہزار بیت می رسید در اصل تحصیل مطلب کافی و مغنی نبود

(ص ۳۰)

باوجودیکہ سلف کی بھی چند کتابیں نظر سے گذری تھیں مگر ان میں سے کوئی بھی ضخامت زیادہ ہونے (یعنی دس بارہ ہزار بیت کی کتاب ہونے کے) باوجود داصل مطلب کی تحصیل کے لیے کافی اور دوسری کتاب سے بے نیاز کردینے والی نہ تھی؛

اس بیان میں سلف کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلف کی نظر سے بہت پہلے کے علماء کی تالیفات اس موضوع پر گذر چکی تھیں اور یہ کہ فہرست مفصل میں جن دو کتابوں کا ذکر ہے مؤلف اس کو مراد نہیں لے رہا ہے، اس لیے کہ جس صدی میں وہ خود رہا ہو اس صدی کے علماء کو سلف سے تعبیر نہیں کرسکتا، دوسرے اس لئے بھی یہ کتابیں مراد نہیں ہوسکتیں کہ یہ دونوں ضخامت میں اس کی کتاب سے چہار گونہ بڑی نہیں ہیں، اس کی مطبوعہ کتاب ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور ان دونوں کے صفحات چار سو سے کچھ اوپر ہیں، یعنی دوگنے سے کچھ زیادہ، برخلاف ان کتابوں کے جن کی طرف مؤلف اشارہ کر رہا ہے، وہ چار گونے کے قریب بڑی ہیں، مولف خود اپنی کتاب کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ تین ہزار اور کچھ کسر پر مشتمل ہے، اور اس کے مقابل سلف کی ہر کتاب دس بارہ ہزار بیت کی بتاتا ہے، اس تطویل سے میرا مقصد یہ ہے کہ مولف کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی اشاریہ سازی کی طرف مسلمان فضلاء گیارہویں صدی سے بھی پہلے متوجہ ہوچکے تھے، یعنی جرمن مستشرق

فلوگل سے صدی ڈیڑھ صدی پہلے نہیں بلکہ صدیوں پہلے حاشیۃ العصام علی البیضاوی کا تعارف کراتے ہوئے کوکب صاحب ص۱۹ پر لکھتے ہیں کہ دوسرا حصہ البناء سے الناس تک ہے، اس بیان میں مؤلف نے کشف الظنون کی پیروی میں غلطی کی ہے صحیح یہ ہے کہ سورۂ انفال کے اول سے الناس تک ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر حاشیہ دو حصوں میں مکمل نہیں ہو سکتا، جس کا حاجی خلیفہ نے دعویٰ کیا ہے، کشف الظنون میں غلطی سے الانفال کے بجائے البناء چھپ گیا ہے۔

لیکن اس سے پہلے خود مولف سے ایک بھول ہوئی ہے، کہ انھوں نے الاعراف کے بجائے الانعام لکھ دیا ہے، اس تصحیح کی تائید خود مولف کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "اس تالیف کا ایک نسخہ سورۂ اعراف کے آخر تک دمشق کے دار الکتب الظاہریہ میں بھی موجود ہے" یعنی پہلا حصہ جو اول فاتحہ سے آخر اعراف تک ہے، وہ دمشق میں بھی ہے۔

ص۲۱ پر ملا صادق حلوائی کے بارے میں فہرست نگار نے لکھا ہے کہ "ارشد صاحب نے اپنے اس سارے بیان کے لیے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا" اس سلسلہ میں مجھے یہ گذارش کرنا ہے کہ نواب علی حسن خاں نے "تذکرہ صبح گلشن" میں مولانا محمد صادق سمرقندی کا ذکر کیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ وہ شمس الائمہ حلوانی کی نسل سے تھے، اور مولانا احمد جندی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، وہ ان علماء اعلام میں سے ہیں، جن کے مرتبہ سے شاعری فروتر چیز ہے، پہلے وطن سے زیارت حرمین کے لیے کمر ہمت باندھی اور یہ سعادت حاصل کرنے کے بعد ہندوستان آئے، اور لاہور میں بیرام خاں سپہ سالار کی عنایت سے مسند تدریس و افادہ کو زینت بخشی، دوسری بار

حج و زیارت کا شوق پیدا ہوا اور حجاز روانہ ہوئے، اس دفعہ لوٹنے کے بعد خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کی تعلیم پر مامور ہوئے، مقبولیت و اطمینان خاطر میں دوسروں سے بہت آگے بڑھ گئے" آخر میں ہندوستان سے کابل گئے اور میرزا حکیم کی معلمی کے لیے صدر مجلس ہوئے، اور اتنا رسوخ بڑھا کہ میرزا کے تمام مہمات کے حل و عقد کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، عمر کے آخر میں سمرقند چلے گئے، اور وہاں سے سفر آخرت اختیار کیا، اس کے بعد ان کے چند منتخب اشعار ذکر کیے ہیں، جن میں سے ایک شعر یہ ہے، ؎

ہمچو خورشید از سفرِ اے ماہ سیما آمدی　　خوب رفتی جان من بیا رزیبا آمدی

اس حوالہ سے یہ معلوم ہوا کہ ملا صادق کی وفات سمرقند میں ہوئی، شاید اسی لیے نزھۃ الخواطر میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،

ص۲۳ پر بحرق حضرمی کی شرح آیۃ الکرسی وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، بحرق کے تعارف کے باب میں یہ اضافہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا ذکر سخاوی نے بھی الضوء اللامع میں کیا ہے، اور بتایا ہے کہ بحرق نے مجھ سے بھی علم حاصل کیا ہے، شاعری سے بہت دلچسپی تھی، عامر بن عبد الوہاب کی مدح میں انھوں نے قصیدہ لکھا ہے، شذرات الذھب سے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کب آئے تھے، ابن العماد ناقل ہے کہ وہ امیر عدن مرجان بن عبد اللہ کی وفات کے بعد ہندوستان آئے اور مرجان کا سالِ وفات خود ابن العماد نے ۹۲۷ھ بتایا ہے، یعنی وہ اپنی وفات سے صرف اڑھائی تین سال پہلے اور سخاوی کی وفات کے ۲۵ برس بعد ہندوستان آئے ہیں، اسی لیے الضوء اللامع میں ان کے ہندوستان آنے کا ذکر

ہے نہ ان کی تصنیفات کا،

فہرست نگار نے بجرق کے استاد کا نام عبداللہ غرمہ لکھا ہے، صحیح عبداللہ
باغرمہ یا عبداللہ ابی مخرمہ ہے،

بجرق کی مطبوعہ کتابوں میں ذیل کی دو کتابوں کے ناموں کا اضافہ بھی ضروری ہے،

(۱) الحدیقة الانیقة فی شرح العروة الوثیقة، (۲) الحسام المسلول
علی منتقصی اصحاب الرسول،

کوکب صاحب نے ان دونوں کے نام لکھے ہیں، مگر ان کے طبع ہونے کی شاید
ان کو اطلاع نہیں ہے الحدیقة الانیقة کو سابق مفتی مصر علامہ حسنین محمد مخلوف نے
ایڈٹ کر کے سنہ ۱۳۳۰ھ میں مطبعة المدنی (مصر) سے شائع کیا ہے، وہ عروہ اور حدیقہ دونوں
کے بیحد مداح ہیں، دوسری کتاب بھی مفتی صاحب ہی نے سنہ ۱۳۶۶ھ میں شائع کی ہے، یہ باطنی
فرقہ کے رد میں ہے، اس کے بارے میں مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بجرق نے اس میں ایک
محقق عالم کے شایان شان اسلام کی طرف سے مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے،

ص۲۰۷ پر علیا وابا طلحة والزبیر کے بجائے علیا وطلحة والزبیر صحیح ہے، بتانا چاہیے
تھا کہ یہ کتابت کی غلطی یا مؤلف کا سہو ہے،

ص۲۰۹ پر جواہر الاصول کو تقی الدین فاسی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور ان کا نام
محمد بن احمد بن علی بتایا ہے فہرست نگار نے تمام تر خدا بخش لائبریری کے فہرست نگار
کی پیروی کی ہے، معلوم نہیں مصنف کا نام محمد بن احمد بن علی کس طرح لکھ دیا گیا جبکہ
جواہر الاصول کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے قال الجامع الجانی تدارکه[1] الله تعالی

---

[1] مطبوعہ میں یوں ادرکہ چھپا ہے، حالانکہ تدارکہ ہے،

بلطفه الكافی ابو الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی اعاذه الله تعالی من
القلب القاسی[1]،

دوسرا تضاد یہ ہے کہ مصنف نے تو خود اپنی کنیت ابو الفیض لکھی ہے، مگر فہرست
نگاروں نے معلوم نہیں کہاں سے ابو الطیب لکھ دیا، حقیقت یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری
کے فہرست نگار سے چوک ہوئی ہے، اس نے فارسی کے بجائے بعض نسخوں میں فاسی
دیکھا، اور محمد بن احمد بن علی تقی الدین فاسی، معاصر حافظ ابن حجر کو ایک بلند پایہ
محدث پایا، تو یہ خیال جا لیا کہ جواہر الاصول کے مصنف وہی ہیں، اور محمد بن محمد کی
طرف یا تو اس نے دھیان نہیں دیا یا یہ سمجھا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، اور چونکہ فاسی
کی کنیت ابو الطیب ہے، اس لیے جواہر کے مصنف کی کنیت ابو الطیب لکھ دی، مانچسٹر کا
فہرست نگار زیادہ ہوشیار اور دیدہ ور معلوم ہوتا ہے اسی لیے اس نے یہ اقرار
کر لیا کہ ہم کو مولف کا سراغ نہیں مل سکا،

تقی الدین فاسی حافظ ابن حجر کے گہرے دوست بلکہ شاگرد بھی تھے، اور حافظ
سخاوی اپنے استاذ کے اس دوست کے بہت بڑے واقف کار تھے، بلکہ روایت میں
شاگرد بھی تھے، انھوں نے ان کا اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ شرح وبسط کے ساتھ کیا
ہے، لیکن جواہر الاصول کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، انھوں نے ان کی ساری
تصنیفات کے نام تو نہیں لکھے ہیں، لیکن یہ بتا دیا ہے کہ کس کس موضوع پر ان کی کتابیں
ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ تو لکھا ہے کہ جو نام ہم نے لیے ہیں ان کے علاوہ اذکار
دعوات اور مناسک پر بھی انھوں نے کتابیں لکھی ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہے، کہ
اصول حدیث میں بھی ان کی کوئی کتاب ہے،

---

[1] دیکھیے مطبوعہ ص۱۲۳، اور مخطوطہ دار العلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ)

جواہر الاصول کا مصنف بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی اس کتاب کے نسخے ہند و بیرون ہند کے مختلف کتب خانوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مکہ معظمہ کے مکتبۃ الحرم میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے، اس نسخہ کی پشت پر شیخ عبد الرحمن بن یحیی معلمی (جو ایک وسیع النظر یمنی عالم تھے، برسوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں مصحح رہ چکے ہیں، آخر میں وہ مکتبۃ الحرم کے مدیر ہو گئے تھے، میرے ان سے دوستانہ تعلقات تھے، جب حجاز حاضری ہوئی تھی تو مکتبۃ الحرم میں کبھی کبھی ان کے پاس نشست ہوا کرتی تھی) کے ہاتھ کی یہ تحریر موجود ہے کہ "یہ کتاب ابو الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی کی تالیف ہے، یہ مصنف فصیح الادیب الحنفی کے نام سے پکارا جاتا تھا" غالباً یہ بات انھیں ایضاح المکنون (تکملہ کشف الظنون) سے معلوم ہوئی ہے۔

صفحہ ۹۲ پر القول الحسن اور شیخ حمید بن عبد اللہ کا ذکر آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس تالیف کے مصنف کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہو سکے، "تیمر استدراکات" میں لکھا گیا ہے کہ بعد میں معلوم ہوا کہ مصنف مذکور شیخ رحمت اللہ سندھی کے بھائی ہیں، یہ بات فہرست نگار نے نزہۃ الخواطر کے حوالہ سے لکھی ہے، اور صاحب نزہۃ الخواطر نے اس کو النور السافر کے حوالہ سے لکھا ہے، اسی حوالہ سے ابن العماد نے بہت پہلے شذرات میں اس کو نقل کیا ہے، معلوم نہیں فہرست نگار نے النور السافر یا شذرات الذہب کی طرف توجہ کیوں نہیں کی، اگر اس کی طرف وہ رجوع کرتے تو ظاہر ہو جاتا کہ صاحب نزہۃ نے یہ بات کہ وہ شیخ رحمت اللہ سندھی کے بھائی تھے النور السافر سے لی ہے، اس میں شیخ رحمت اللہ سندھی کے حال میں یہ صراحت پائی جاتی ہے،

وکان لہ اخ اسمہ حمید — شیخ رحمت اللہ کے ایک بھائی تھے جن کا نام

کان ایضاً من اھل العلم	حمید تھا، وہ بھی صاحب علم وصلاح تھے، خوش
والصلاح حسن الاخلاق	اخلاق، بڑے متواضع، فضل وکمال میں نمایاں
کثیر التواضع ظاھر الفضل	اور جلیل القدر تھے، آخر عمر میں ان کو دنیاوی
جلیل القدر وحصل لہ فی آ	عزت وعظمت بھی حاصل ہو گئی تھی،

(شذرات الذہب ج ۸ ص ۴۲۱، النور السافر ص ۴۰۲)

ان دونوں میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں نو برس مقیم رہے، اور وہیں وفات پائی، اور ان میں سب سے بڑی بات یہ مذکور ہے کہ وہ ابن علان صدیقی کے پوتے محمد علی کے شیخ تھے، اور وہ سید محمد بن سید حمزہ حسینی شیخ الاسلام ونقیب الاشراف دمشق کے استاذ تھے، تعجب ہے کہ ابن العماد نے ان کا سال وفات نہیں لکھا، شاید اس لیے کہ ان کی وفات سنہ ۱۰۱۰ھ کے بعد ہوئی ہے، اور انھوں نے صرف سنہ ۱۰۱۰ھ کے اندر وفات پانے والوں کا تذکرہ لکھا ہے،

شیخ حمید سے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے حدیث کی اجازت لی تھی اس کا ذکر خود محدث دہلوی نے ثبت الشیخ عبد الحق المحدث الدہلوی میں کیا ہے، اس رسالہ کے آغاز میں انھوں نے اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں،

"ثم الشیخ العالم العامل تذکرۃ السلف المتودعین وبقیۃ المشائخ المحدثین مولانا الشیخ حمید الدین بن القاضی عبد اللہ السندی"

پھر ایک شیخ کا اجازت نامہ بھی نقل کیا ہے، یہ سب اجازت نامے سنہ ۹۹۸ھ کے ہیں، صاحب نزہۃ نے اسی ثبت کے پیش نظر حمید الدین کے نام سے ان کا ذکر کیا ہے، شیخ حمید سے استفادہ کرنے والوں میں شیخ عبد الحق کا نام لینا اس کی دلیل ہے کہ یہ ثبت صاحب نزہۃ کے پیش نظر تھا، حالانکہ شیخ عبد الحق نے زاد المتقین میں جہاں

جہاں شیخ حمید کا نام لیا ہے، ان کو حمید الدین کے بجائے شیخ حمید یا شیخ حمید محدث ہی لکھا ہے[1]

شیخ عبدالحق نے زادالمتقین میں لکھا ہے کہ یہ لوگ تین بھائی تھے، شیخ رحمۃ اللہ، شیخ حمید، اور شیخ صالح، ان کے والد بزرگوار قاضی عبداللہ سندھ سے چل کر کچھ دنوں احمد آباد میں شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے، پھر حرمین کی زیارت اور مدینہ منورہ میں توطن کی سعادت حاصل کی،

قاضی عبداللہ کے ایک یار و مصاحب شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندی تھے، قاضی عبداللہ کی وفات کے بعد ان کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت انھیں کے ہاتھوں ہوئی،

اشتباہ دور کرنے کے لئے تذکرہ نویسوں پر لازم ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ یا شیخ حمید کی ولدیت بیان کرنے کے وقت "ابن قاضی عبداللہ" لکھیں، اور دوسرے عبداللہ کو ہمیشہ شیخ عبداللہ کے عنوان کے ساتھ لکھیں، جیسا کہ شیخ عبدالحق کا معمول تھا،

قدیم تذکرہ نویسوں نے شیخ حمید کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا، فہرست مفصل اور پنجاب یونیورسٹی کے ہم ممنون احسان ہیں کہ ان کی بدولت ہم کو شیخ حمید کی اس قیمتی تالیف کا علم ہوا،

اب تک ہم یہی جانتے تھے کہ شیخ رحمۃ اللہ ہی اس میدان کے شہسوار ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ ایں خانہ تمام آفتاب است، اگرچہ اتنا فرق اب بھی

---

[1] دیکھئے زادالمتقین قلمی ص۲۵ و ص۲۲

باقی ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ اور ان کی تصنیفات کا پایہ بہت بلند ہے، ان کی کتاب جمع المناسک و نفع الناسک کی قدردانی و مدح سرائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ شیخ علی متقی اس کے باب میں فرمایا کرتے تھے،

ایں کتابیست کہ در مناسک حج بے عدیل و بے نظیر واقع شدہ است[1]	یہ ایسی کتاب ہے کہ مناسک حج میں بے مثل و بے ہمتا واقع ہوئی ہے،

اور شیخ عبدالحق اس کی تائید یوں فرماتے ہیں،

و در واقع آں کتاب ازیں قبیل است کہ از ہمہ رسائل کہ دریں باب تصنیف یافتہ اند حاوی تر و شامل تر است[2]	اور درحقیقت یہ کتاب اسی قبیل سے ہے کہ جتنے رسائل اس باب میں تصنیف ہوئے ہیں، سب سے زیادہ حاوی ہے

خفی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ عبدالقادر عیدروس نے النور السافر میں "جمع المناسک و نفع الناسک" کو عبداللہ بن سعد اللہ کی تصنیف قرار دیا ہے، نزہۃ الخواطر میں اسی کو جوں کا توں نقل کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں ٹرکی کے مطبع محمودیہ میں طبع ہو چکی ہے، اس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا ہے:

انتقل الی رحمۃ اللہ تعالیٰ مولف هذا الکتاب الشیخ رحمۃ اللہ فی الضحوۃ الکبری من یوم الجمعۃ ثامن عشر محرم الحرام سنۃ اربع وتسعین وتسعمأۃ	اس کتاب کے مؤلف شیخ رحمۃ اللہ نے بوقت ضحوۂ کبریٰ جمعہ کے دن ۱۸ محرم ۹۹۴ھ کو انتقال کیا، اور معلا میں مدفون ہوئے،

---

[1] زادالمتقین قلمی ص۲۵ [2] زادالمتقین قلمی ص۲۵

اور ملا علی قاری جو خود شیخ عبد اللہ سندی کے شاگرد ہیں لباب المناسک کی شرح میں لکھتے ہیں: انی لما رأیت لباب المناسک مختصر نفع المناسک للعالم العامل الفاضل الفہامۃ مرشد السالکین ومفید الناسکین الشیخ رحمۃ اللہ السندی،

اور شرح لباب کا محشی لکھتا ہے کہ نفع المناسک اسم للمنسک الکبیر لمانن رحمہ اللہ بمبئی میں اس کتاب کا ایک نسخہ جس کا سن کتابت ۱۰۶۸ھ ہے میری نظر سے گذرا ہے اس کے سرورق پر المنسک الکبیر للشیخ رحمۃ اللہ السندی المکی استکتبہ الفقیر عبد الرحیم اللاھوری ثم المدنی الحنفی ۱۰۶۸ھ لکھا ہوا ہے، اس کتاب کے دیباچہ میں مولف نے لکھا ہے

وسمیتہ بجمع المناسک ونفع الناسک۔

شیخ علی متقی نے نفع المناسک کے مختصر لباب المناسک کا خلاصہ فارسی میں عجالۃ الناسک کے نام سے لکھا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے،

تعجب ہے کہ مولانا عبد الحئی رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ رحمۃ اللہ کی تصنیفات میں لباب المناسک کا نام لیا اور جس کتاب کا یہ اختصار ہے، اس کا نام ہی نہیں لیا، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ عبد القادر عیدروس نے نفع الناسک کو شیخ عبد اللہ بن سعد اللہ کی تصنیف بتا کر غلط فہمی پیدا کر دی ہے،

شیخ رحمۃ اللہ کے ذکر میں ایک سہو یہ بھی ہوا ہے کہ ان کی وفات کی تاریخ ۸ محرم (لثمان خلون من المحرم) بتائی گئی ہے حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ان کی وفات ۱۸ محرم کو ہوئی ہے[۲]

شیخ حمید کے تذکرہ کے ضمن میں ہم نے شیخ رحمۃ اللہ اور ان کی کتاب جمع المناسک

---

[۱] صفحہ ۶۴۵ سنہ ۲ دیکھئے نفع الناسک مطبوعہ کا سرورق، اور شذرات الذہب جلد ۸ صفحہ ۲۴۳

کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لیے بھی کیا کہ فہرست مفصل صفحہ ۱۴۹ پر پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطہ جمع المناسک کا تعارف کرایا گیا ہے،

کورکیس صاحب نے معجم المخطوطات کے حوالہ سے جمع المناسک کے جس مطبوعہ ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، ہمارے پاس وہی ایڈیشن ہے مگر بروکلمن کے حوالہ سے یہ جو لکھا ہے کہ "کتاب کی نقط تلخیص طبع ہوئی ہے" یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ پوری کتاب طبع ہوئی ہے ہاں اس کے ساتھ شیخ احمد گشتی نوی مرشد طریقہ نقشبندیہ نے اپنی ایک کتاب "جامع المناسک" بھی چھاپ دی ہے، جو "جمع المناسک" کی تلخیص ہی کی طرح ہے، شاید اسی کو دیکھ کر بروکلمن نے یہ لکھ دیا ہو کہ جمع المناسک کی صرف تلخیص طبع ہوئی ہے،

اس سلسلہ میں چند اور باتوں کی وضاحت بھی ضروری ہے،

پہلی بات یہ ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ نے اپنے والد کے ساتھ کاٹھیاواڑ کا سفر نہیں کیا تھا، بلکہ احمد آباد آئے تھے، اور قیام کیا تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ ترک وطن (سندھ) کا محرک صرف جذبۂ تحصیل علم نہ تھا، بلکہ بعض ملکی و سیاسی حالات کی بنا پر ان کے والد نے اپنے لڑکوں، اہل و عیال اور خدام کی ایک جماعت کثیر کے ساتھ زیارت مدینہ اور وہاں سکونت اختیار کرنے کے ارادہ سے سندھ کو خیر باد کہا تھا، اور احمد آباد پہنچ کر کچھ دنوں کے لیے مقیم ہو گئے تھے اور شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کر لی تھی، پھر جب شیخ کی توجہ سے زاد راہ کا انتظام ہو گیا تو منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے اور حجاز مقدس پہنچ کر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، کچھ دنوں کے بعد شیخ رحمۃ اللہ کے والد بزرگوار قاضی عبد اللہ کا انتقال ہو گیا تو شیخ عبد اللہ نے شیخ رحمۃ اللہ اور ان

کے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لے لی۔

شیخ رحمت اللہ کی نشو و نما مدینہ منورہ میں ہوئی، اور وہ سالہا سال وہیں درس و تدریس اور عبادت میں مشغول رہے تا آنکہ ۹۷۷ھ میں بعض حوادث کی بنا پر مجبور ہو کر پھر ہندوستان کا رخ کیا اور احمد آباد آکر مقیم ہو گئے، آخر عمر میں بیمار ہو گئے بیماری ایسی تھی کہ حس و حرکت مفقود تھی، مگر اسی حالت میں مقامات مقدسہ کا عزم بالجزم کر کے احمد آباد سے روانہ ہوئے مکہ معظمہ پہونچنے تک کی مہلت ملی وہاں پہونچ کر سفر آخرت اختیار کیا۔

یہ پوری تفصیل اخبار الاخیار اور زاد المتقین میں موجود ہے، فہرست مفصل میں جو تفصیل دی گئی ہے اس بیان سے اس کی کئی باتوں کی وضاحت اور تنقیح ہو جاتی ہے۔

ترکی حکومت کے وظائف کا جو واقعہ کوکب صاحب نے لکھا ہے اس کے بارے میں شیخ عبد الحق یہ لکھتے ہیں کہ شیخ علی متقی ان کے تقویٰ کا خیال کر کے ان کے لئے وظیفہ لیتے ہی نہیں تھے۔

کوکب صاحب ص۹۷ پر لکھتے ہیں کہ "صرف ملا حیدر کے کچھ احوال حیات بعض کتب تذکرہ میں ملتے ہیں"۔ راقم ناچیز کہتا ہے کہ جس طرح ملا حیدر کے کچھ حالات ملتے ہیں اسی طرح ملا محمد معین ولد ملا مبین کے حالات بھی اسی نزہۃ الخواطر میں لکھے ہوئے موجود ہیں، ملاحظہ ہو جلد ہفتم ص۴۶۸، اور مولوی محمد صفدر (پسر اوسط یعنی بیچ لڑکے) ملا مبین کے باب میں صرف اتنا مذکور ہے کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی اور مولانا ولی اللہ کے پاس علم حاصل کیا ان کی استعداد بہت اچھی تھی، عین جوانی میں بعارضۂ جنون، ہو کر انتقال کر گئے۔

اخبار الاخیار ص۲۷۳، زاد المتقین قلمی ص۲۸۲

(صفحہ ۲۳ (اعفان اربعہ)

ص۱۰ میں التحریر پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے، یہ ابن الہمام کی مشہور کتاب ہے، اور مصنف کے شاگرد رشید ابن امیر الحاج کی شرح سمی التقریر والتحبیر کے ساتھ مصر میں طبع ہو چکی ہے، التحریر کے بعد التقریر سے اسی شرح کی طرف اشارہ ہے یہ بھی ممکن ہے کہ التحریر سے اصول بزدوی کی وہ شرح مراد ہو جو علاء الدین مغلطائی نے اسی نام سے لکھی ہے اور التقریر سے اکمل الدین بابرتی کی شرح اصول بزدوی مراد ہو۔

ص۲۲ پر صاحب بدائع کے ایک مناظرہ کا ذکر ہے جو سلطان روم کے دربار میں ہوا تھا اور صاحب بدائع نے برہم ہو کر بقول کوکب صاحب کے ڈنڈا اٹھا لیا تھا اس کے بعد کوکب صاحب لکھتے ہیں کہ "اس پر سلطان نے کہا یہ تو بد تمیزی ہے"۔

کوکب صاحب نے غالباً اس واقعہ کو الجواہر المضیئۃ سے نقل کیا ہے اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ "یہ بد تمیزی ہے"۔ اس میں تو صرف ھذا افتات علی الفقیہ ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے زیادتی کی، یا حد سے آگے بڑھ گئے۔

اس کے بعد کوکب صاحب لکھتے ہیں کہ سلطان نے الکاسانی کو الحلاویہ کا والی بنا کر بھیج دیا۔

کوکب صاحب کے طرز تعبیر سے دھوکا ہوتا ہے کہ الحلاویہ کوئی ملک یا صوبہ ہے درصورتیکہ حلاویہ حلب کے ایک مدرسہ کا نام ہے اس مدرسہ کے صدر مدرس بانی پرنسپل کاسانی سے پہلے رضی الدین سرخسی تھے ان کے ہم عصروں نے معاصرانہ چشمک کی بنا پر نور الدین زنگی سے شکایت کر کے ان کو برطرف کرا دیا حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں کاسانی ترکی حکومت کی طرف سے سفیر بنا کر حلب بھیجے گئے تھے۔

اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نور الدین زنگی نے رضی الدین کی جگہ کاسانی کو مدرسہ کی صدارت و تولیت سپرد کر دی۔

الفوائد البہیہ میں ہے

فانعزل (رضی الدین) عن التدریس وسار الی دمشق، وکان صاحب البدائع قد ورد فی ذالک الزمان دمشق فکتب لہ نور الدین خطہ بالمدرسۃ الحلاویۃ فتولی التدریس بہا۔[1]	پس رضی الدین درس سے سبکدوش ہو گئے اور دمشق چلے گئے اور صاحب بدائع اسی زمانہ میں سفیر ہو کر آئے تھے نور الدین نے ان کی بابت مدرسہ حلاویہ میں خط لکھا اور وہ اس میں منصب تدریس پر مامور ہو گئے

مدرسہ حلاویہ کی نسبت محمد کرد علی لکھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مدرسہ تھا طلبہ کی تعداد بہت ہی زیادہ اور اس میں وظائف اور تنخواہوں کا معیار بھی بہت اونچا تھا ۵۴۳ھ میں نور الدین شہید نے ناداروں کے لئے بہت سے حجرے بنوا دیئے تھے (خطط الشام ص ۹۹) اس مدرسہ کی عمارت اب بھی باقی ہے حلب کی جامع اموی یا جامع کبیر کے پچھم جانب ایک بازار میں اس کا شاندار قدیم پھاٹک ہے مگر اسکی معنویت ختم ہو چکی ہے میں نے ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ میں اس کی زیارت کی ہے۔

یہی مضمون بلکہ اس سے کچھ زیادہ الجواہر المضیئۃ (ص ۱۲۹ ج ۲) میں ہے۔

ص ۱۲ پر حاجی خلیفہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ابن الضیاء ... نے اس تالیف کی شرح ضیاء المعنویہ فی المقدمۃ الغزنویہ کے نام سے لکھی" شرح کا نام کشف الظنون

[1] ص ۱۲۹ طبع مصر

میں بے شبہہ ایک جگہ یوں ہی لکھا ہے اور دوسری جگہ ضیاء المعنویہ لکھا ہے مگر صحیح نام الضیاء المعنوی شرح مقدمۃ الغزنوی ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ فرنگی محل (لکھنؤ) میں مفتی عبد القادر صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا مگر افسوس ہے کہ وہاں اس کتاب کا صرف نصف اول ہے۔

ص ۱۳۵ پر لکھتے ہیں کہ "مؤلف کی نسبت اشروسنی" "اشروسنہ" بستی کی طرف ہے .... بستی کے نام میں دوسری لغت "اسروشنہ" ہے یاقوت نے بیان کی ہے مگر پہلی لغت (ہمزہ کے ضمہ اور شین منقوطہ کے ساتھ) "الاشہر الاعرف" کہا گیا ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ کبھی اسروشنہ میں ایک تاء کا اضافہ کر کے استروشنہ کہتے ہیں، چنانچہ فوائد بہیہ میں ابو جعفر الاستروشنی اور محمد بن محمود الاستروشنی ہی لکھا ہے اسی طرح جواہر مضیئہ کے انساب میں بھی الاستروشنی ہی ہے اگرچہ سمعانی کی تصریح کے بموجب اسروشنہ ہی صحیح ہے۔[1]

ص ۱۳۶ پر احکام الص... مولفہ اسروشنی کا تعارف ختم کرنے سے پہلے فہرست نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلمی نسخے دوسرے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں یا نہیں اس لئے ایک مختصر سی نشاندہی کی جاتی ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ بلدیہ اسکندریہ میں ہے اور ہندوستان میں کتب خانہ شاہ پیر محمد (احمد آباد) میں ایک نسخہ میں نے دیکھا ہے دوسرا دار العلوم امدادیہ (بمبئی) کے کتب خانہ میں ہے اس کو بھی احقر نے دیکھا ہے۔

[1] فوائد بہیہ

ص۱۵۹ پر لکھتے ہیں کہ "بہرحال مذکورہ معلومات کی بنیاد پر مولف کا سال وفات دسویں صدی ہجری کے اندر محدود کرنا بے اصل بات ہے۔

فہرست نگار کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے، جعفر بوبکانی کی تالیفات میں فہرست نگار نے عجالۃ الطالبین کا ذکر کیا ہے، مگر یہ کتاب فہرست نگار کی نظر سے نہیں گذری ہے، میں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں دیکھا ہے، اس میں مؤلف نے تصریح کی ہے کہ وہ ۹۹۲ھ میں عجالۃ الطالبین کی تالیف سے فارغ ہوا،

فہرست نگار کے پاس جعفر کے ۹۷۹ھ ہی تک زندہ رہنے کا تحریری ثبوت تھا، اس نئے حوالہ سے اس کی زندگی میں تیرہ ۱۳ سال کا مزید اضافہ ہوا،

یہاں یہ بتا دینا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے کہ عجالۃ الطالبین شیخ محمد طاہر پٹنی کی تذکرۃ الموضوعات کا مختصر ہے، میں نے سرسری طور پر اس کا مطالعہ کیا ہے،

ص۱۸۶ میں اذانی شغالی پر سوالیہ نشان ہے، یہ درحقیقت ارانی تعالی ہے، کاتب نے تعالی کو شغالی بنا ڈالا، یہ اسی طرح ہے جیسے قال تعالی،

یہ محرف لفظ دوبارہ اسی تحریف کے ساتھ ص۱۹۸ پر وارد ہوا ہے،

ص۲۰۵ پر طبرزد الکندی کے بجائے ابن طبرزد الکندی صحیح ہے

ص۲۰۶ پر حافظ مزنی کے بجائے حافظ مزّی صحیح ہے

ص۲۰۶ پر علامہ کلاباذی کے حق میں حافظ ذہبی کا بھرپور ریمارک نقل نہیں کیا گیا، ذہبی نے اس تقریب سے کہ وہ ان کے رفیق درس (سماع حدیث) تھے، اور اسی حیثیت سے ذہبی نے ان سے فائدہ اٹھایا تھا، ان الفاظ میں ان

کا ذکر تذکرۃ الحفاظ میں کیا ہے،

سمعت مع الشیخ العلامۃ الفرضی المحدث الصالح شمس الدین ابی العلاء محمود بن ابی بکر الحنفی وکان احد من عنی بھذا الشان ورحل وکتب والف، سمعت منہ ....

....

.... متقنا للکتابۃ [1]

کوکب صاحب کی نقل سے کلاباذی کا صرف عارف حدیث ہونا معلوم ہوتا ہے، اور ہمارے حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پختہ کار عالم تھے، اور انھوں نے فن حدیث کا خاص اہتمام کیا تھا، اور انھوں نے اس کے لیے ملک ملک کی خاک چھانی تھی، حدیثیں سن کر ان کو لکھا تھا، اور اس فن میں وہ صاحب تالیف ہیں، اور ذہبی جیسے بلند پایہ محدث کا اعتراف ہے کہ اس نے بھی کلاباذی سے حدیثیں سنی ہیں،

ذہبی نے اس سے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت المعجم المختص میں دیا ہے، اس میں انھوں نے ان کے حق میں یہ الفاظ لکھے ہیں،

الحافظ الامام المحدث المتقن،

اور مشتبہ النسبۃ میں بھی الحافظ اور امام و مصنف جیسے الفاظ ان کے حق میں لکھے ہیں [2]

---

[1] ص ۴/۲۶۴ [2] دیکھیے مشتبہ النسبۃ ص ۲/۴۵۲

مطبوعات جدیدہ

حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق :۔ از مولانا محمد تقی عثمانی، بڑی تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۲، مجلد، قیمت اٹھارہ روپے، پتہ: الجمعیۃ بک ڈپو، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، مولانا محمد تقی عثمانی نے بھی اپنے رسالہ البلاغ کے کئی نمبروں میں اس کا جواب تحریر کیا تھا، یہ کتاب اسی کا مجموعہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں سیدنا حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق خلافت و ملوکیت کے مندرجات پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے "خلافت و ملوکیت" ہماری نظر سے نہیں گذری، اس جوابی تصنیف میں اس کی جن قابل اعتراض باتوں کا جواب دیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں، حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں سیاست دین کے تابع نہ تھی۔ وہ اس کے تقاضے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، انھوں نے قانون کی بالاتری ختم کردی تھی، اپنے گورنروں کی زیادتیوں پر قانون کے مطابق کارروائی نہیں کرتے تھے، آزادیٔ رائے کا خاتمہ کر دیا تھا، وہ خود اور ان کے امرا حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے، انھوں نے یزید کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ولی عہد نامزد کیا اور اس کے لیے بیعت لینے میں جبر و اکراہ، خوف و طمع اور کھلم کھلا رشوت سے کام لیا وغیرہ، حضرت معاویہؓ جلیل القدر صحابی، کاتب وحی اور اسلام کے بڑے مدبروں میں تھے، گو وہ معصوم نہ تھے، تاہم دوسرے

صحابہ کی طرح عادل تھے، مصنف کے خیال میں مولانا کے اعتراضات کو صحیح تسلیم کرنے کا لازمی منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ فسق و فجور جیسے بڑے گناہوں کے نہ صرف مرتکب تھے، بلکہ انھوں نے ان کو اپنی باقاعدہ اور مستقل پالیسی بنا لیا تھا، جو ظاہر ہے کہ عدالت کے منافی ہے، اس سلسلہ میں عدالت صحابہ پر مفید اور معتدل بحث کی گئی ہے، انھوں نے مولانا مودودی کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ تاریخی روایات کے معاملہ میں اگر حدیثوں ہی کی طرح جرح و تعدیل کے معیار پر تحقیق و تنقید شروع کی گئی تو تاریخ اسلام کا کم از کم ۹/۱۰ حصہ ناقابل قبول قرار پائے گا، علاوہ ازیں حدیث کے رد و قبول میں بھی احکام و عبادات سے متعلق روایات میں زیادہ کاوش کی جاتی ہے اور فضائل و ترغیبات میں کمتر درجہ کی روایتیں بھی قبول کی جاتی ہیں، اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں جن تاریخی روایات کا معاملہ ہے ان کی زد عقائد پر پڑتی ہے، اور عقائد کی اہمیت احکام و عبادات سے بھی زیادہ ہے، اس لئے ان پر بھی جرح و تعدیل کے ان ہی اصولوں سے کام لیا جائے گا، آخر میں حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت پر تبصرہ کرکے اس کی صحیح نوعیت واضح کی گئی ہے، وہ گو ان کی خلافت کو خلافت راشدہ سے کمتر سمجھتے ہیں، لیکن مولانا مودودی نے اس کو جس طرح ظلم و تعدی اور فسق و فجور سے ملوث قرار دیا ہے، اس کی مدلل تردید کی ہے، مصنف اپنے والد مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی طرح تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور پاکستان کے سنجیدہ اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں، وہ مولانا مودودی کے جواب میں غصہ اور جھنجھلاہٹ کے اظہار اور ذاتی طعن و تشنیع کے بجائے علمی انداز سے بحث کرتے ہیں، ان کے اخذ کردہ بعض نتائج سے اختلاف کی گنجائش ہے، اور کہیں کہیں ان کے خیالات میں الجھاؤ بھی ہے، مثلاً ہر مسلمان کے کافر کے وارث ہونے یا نہ ہونے پر گفتگو کے ضمن میں فتح الباری کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں کافر کے بجائے اہل کتاب کا ذکر ہے، ظاہر

ہے کہ دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں، ص۸۱ پر لکھا ہے کہ بخت نصر کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ حضرت مسیحؑ کے فضلات پاک تھے یا ناپاک، حالانکہ بخت نصر کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے قبل تھا، ایک جگہ "التماس" کو مذکر لکھا ہے، ممکن ہے یہ سہو کتابت کا نتیجہ ہو، اس تحریر کا جماعت اسلامی کے ایک پرجوش کارکن جناب غلام علی نے ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں جواب دیا تھا، مصنف نے البلاغ میں ان کے خیالات کی تردید کی تھی، یہ مضمون اس کتاب کے دوسرے حصہ میں شامل ہے، تیسرے حصہ میں امیر المومنین حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل و مناقب درج ہیں، جن کو پڑھ کر ان کی عظمت، کمالات، اور کارناموں کا اندازہ ہو جاتا ہے، یہ حصہ ان کے برادر زادہ مولوی محمود اشرف عثمانی کا تحریر کردہ ہے اگر مصنف اس پر ایک نظر ڈال لیتے تو عبارت کی تکرار اور تحریر کی ناہمواری دور ہو جاتی۔

تفسیر ماتریدی (سورۂ فاتحہ): تحقیق و ترجمہ ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی متوسط تقطیع کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۷۲ قیمت تحریر نہیں پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، پاکستان،

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی امام ابو حنیفہؒ کے عقائد و کلامی مذہب کے ترجمان ہونے کی بنا پر متکلمین احناف کے پیشرو اور امام سمجھے جاتے ہیں، انکے اعتقادی مذہب کو بلاد ماوراء النہر وغیرہ میں وہی اہمیت حاصل تھی جو عرب ممالک میں اشاعرہ کو حاصل تھی، کلام کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی انکی متعدد تصنیفات تھیں مگر یہ سب ناپید ہیں، البتہ انکی تفسیر تاویلات السنۃ کا ایک قدیم مخطوطہ استنبول میں موجود تھا جسکا عکسی نسخہ دار الکتب المصریہ میں بھی تھا، اسی کی مائکرو فلم ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان نے حاصل کر کے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا متن مع اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور آئندہ دوسرے حصوں کی اشاعت بھی پیش نظر ہے، مگر اب المجلس الاعلی للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے بھی تفسیر کی پہلی جلد شائع کر دی ہے، سورہ فاتحہ کی یہ مختصر تفسیر اپنی قدامت اور مفید نکات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے، شروع میں فاضل مترجم نے امام ابو منصور کے حالات و کمالات اور تفسیر کی خصوصیات تحریر کی ہیں،

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین